ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

دسمبر 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 12

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
روئیداد، سالانہ کنونشن طلوع اسلام 2017ء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	4
عورت کا مقام قرآن کی نظر میں	ڈاکٹر طاہرہ اکرم، گجرات	12
دین اسلام کا ابتدائی تنظیمی نظام	ملک محمد صفدر فیضی، ملتان	14
قرآنی اقدار اور انسانی نفسیات	ڈاکٹر عبدالرزاق، لاہور	20
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	خالد بشیر فاروقی، لاہور	34
قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	غلام احمد پرویزؒ	36
قرآن کریم مذہب کے خلاف ایک احتجاج ہے	خواجہ ازہر عباس، کراچی	48

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: ۰۴۶۵۰۰۴۰۷۳۱۷۷۶۷۲
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سالانہ کنونشن طلوعِ اسلام

منعقدہ لاہور 2017ء کی روئیداد

21 اور 22 اکتوبر 2017ء کو گلبرگ لاہور میں منعقدہ طلوع اسلام کے سالانہ کنونشن کے موقع پر ملکی و غیر ملکی شرکاء نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ 21 اکتوبر کا پہلا اجلاس (ورکشاپ: فکرِ قرآنی کو کیسے پیش کیا جائے از عاطف طفیل) صبح 11 بجے شروع ہوا اور لنچ کے لئے 2 بجے اختتام پذیر ہوا۔ اس دوران ایک علیحدہ اجلاس نمائندگانِ طلوع اسلام کا ادارہ کے لائبریری ہال میں انتظامی امور نبٹانے کے لئے ہوا۔ لنچ کے بعد دوسرا اجلاس سہ پہر 3 بجے شروع ہوا اور رات 8:30 تک جاری رہا۔

پہلے اوپن اجلاس میں ورکشاپ کا انعقاد ہوا اور دوسرے سہ پہر کے اجلاس میں پہلا خطاب گلاسکو سے محترم اعجاز رسول نے اپنی ترجمہ کردہ تصنیف What is Islam? کا سرسری طور پر ایک تعارف پیش کیا۔ اُنہوں نے اپنے کمنٹس میں پاکستان کے حوالہ سے محترم نواز شریف کی طرف سے زبانِ زدِ عام سوال کہ ''مجھے کیوں نکالا گیا'' کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا کہ اُنہیں کرپشن کا بازار گرم کرنے کے جُرم میں قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت سزا دی گئی ہے۔ ہمارے مقرر دوست نے دوسرے کا موقف پیش نہیں کیا۔ اگر تحقیقی انداز میں بات کی جائے تو یکطرفہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا جب تک کہ دوسرے کے موقف کو سامنے نہ لایا جائے۔

مُحترم نواز شریف کو عدلیہ کی طرف سے جو سزا سُنائی گئی ہے، وہ کرپشن کے جرائم پر نہیں ہے، کیونکہ اُن جرائم کی نیب کورٹ میں علیحدہ سماعت ہو رہی ہے اور فیصلہ ابھی نہیں ہوا۔ اُن کی نااہلی کی سزا کے فیصلہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے معاہدہ کی رو سے تنخواہ وصول کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا وہ اِس تنخواہ نہ لینے اور اس کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود قابلِ وصول کی اہلیت کی بِنا پر اپنے ممکنہ اثاثہ جات میں اس معاہدی تنخواہ کے شامل ہونے کی صلاحیت کا انکار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اثاثہ ہونے کی اِس صلاحیت ہونے کے باوجود اِن کو الیکشن کمیشن میں الیکشن لڑتے وقت ڈیکلیر نہ کرنے کی بنیاد پر وہ صدیق و امین نہ رہنے کی بِنا پر تاحیات نااہل قرار دیئے گئے۔ حق بات تو یہی ہے کہ وزیرِ اعظم کو اِس عُجلت سے نکالنے پر متذکرہ سوال کہ مجھے کیوں نکالا گیا، اب عام لوگوں کے ذہن میں بھی آتا رہتا ہے۔ انصاف کے بول بالا کے لئے وضاحت مانگنا ضروری

خیال کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ قرآنی نظام کے قوانین کے نفاذ کی عدم موجودگی میں دنیا کے کسی مُلک میں بھی داخلی طور پر از خود اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت جزا دینے کا عمل دنیا کے کسی کونے میں عصرِ حاضر میں نہیں اپنایا جا رہا، بلکہ خارجی طور پر انسانوں کے وضع کردہ اور نافذ کئے ہوئے مُلکی آئین وقوانین کے تحت سزا دی جاتی ہے۔

ان کے بعد منیجر طلوع اسلام ٹرسٹ حسین قیصرانی صاحب نے ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہونے والے کاموں کی تفصیل سے حاضرین کو آگاہ کیا۔

دوسرے مقرر جناب یاسر صدیقی صاحب نے حج کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے درجِ ذیل آیت کی تشریح کرتے ہوئے اِس بات پر زور دیا کہ اِس آیت میں مجازی طور پر عربی زبان کا استعمال کر کے نچلے غریب افراد کو حج کی دعوت دی گئی ہے۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ (22:27)

اور لوگوں میں منادی کر دے کہ لوگ تیرے پاس پا پیادہ بھی اور دُبلے پتلے اونٹوں پر بھی دور دراز کی تمام راہوں سے آئیں گے۔

یہ عمومی ترجمہ محترم مودودی صاحب نے کیا ہے اور علامہ پرویز نے بھی اسی قسم کا مفہوم بیان کیا ہے۔

محترم یاسر صدیقی نے البتہ اس ترجمہ سے اختلاف کرتے ہوئے یہاں عربی زبان کی باریکیوں سے نکات اخذ کر کے ضامر اور عمیق سے مراد مجازی گفتگو کے انداز میں غریب طبقہ کو حج کی دعوت دینے پر زور دیا۔ اُن کا موقف سُن کر مجھے فلسفہِ حج اور قربانی پر منعقدہ مجلسِ مذاکرہ یاد آ گئی جو دنیا ٹی وی نے میرے، محترم غامدی صاحب اور محترم مُفتی منیب الرحمان صاحب کے درمیان شراکت سے نشر کی۔ اُس نشست میں اینکر کی جانب سے مجھ سے سوال کیا گیا کہ کیا حکومت کے خزانے میں غیر مُلکی کرنسی کی شدید قِلت ہونے کی بِنا پر پاکستان کی حکومت ایک دو سال کے لئے حج پر پابندی لگانے کی کیا مجاز ہے؟

میری رائے میں فوری طور پر ہاں میں جواب دیا گیا کہ حج کی ادائیگی کے لئے تو بنیادی طور پر استطاعت کی شرط عائد کی گئی ہے، لہٰذا پابندی نہ لگانے کی صورت میں مُلک کی استطاعت میں مزید کمی اور غُربت اور تنگی آ جائے گی۔ اللہ کا قانون لوگوں کو تنگی نہیں بلکہ آسانی مہیا کرنے کا ضامن ہے۔ ایسی صورت میں حج کی استطاعت نہ رکھنے کے اصول پر حج کا ارادہ کرنے پر اصرار نہیں بلکہ استطاعت کی عدم موجودگی کی بِنا پر پابندی لگانے کا متقاضی ہونا چاہیے۔

پہلے دِن کی مجلس کے آخر میں ہمارے ہر دِل عزیز صاحبِ صدر مجلس محترم ڈاکٹر حامد میاں صاحب کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ اُنہوں نے نہایت سنجیدگی سے قرآن کے مُختلف موضوعات کو نکھار کر سمجھانے کی موثر وضاحت پیش کی۔ وہ اپنے خطاب میں تواتر سے اصرار کرتے رہے کہ ہمیں عمومی طور پر انگریزی میں بولے گئے الفاظ Seeing is believing کی

ترتیب کو Believing is seeing میں بدل دینا چاہیے۔ ترتیب کی بدلی کی منطق مجھے اور ساتھ بیٹھے میرے بھائی کو جو پورے انہماک سے دلائل سُن رہے تھے، دیر ہی سے سہی لیکن سمجھ میں آ گئی۔ باقی سبھی سامعین کو کیا وہ تبدیلی کے نعرہ سے پوری طرح مطمئن (Convince) کر سکے، اِس کا اندازہ لگانا مُشکل ہے۔ البتہ شک پیدا کرنے میں ضرور کامیاب رہے۔

دوسرے دِن 22 اکتوبر کو ایک شاندار ہال میں باقاعدہ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن اور علامہ اقبالؒ کے کلام سے ادارہ کے چیرمین محمد اکرم راٹھور نے بڑی دلجمعی سے کیا۔ بعد میں ادارہ کے روایتی انداز میں دِلی محبت کا اظہار کرتے ہوئے سبھی سامعین کو خوش آمدید کہا۔ سٹیج سکریٹری کے فرائض حسبِ معمول لاہور بزم کے نمائندہ محترم عُمر صاحب نے اپنے دِلفریب میٹھے، لیکن مدبرانہ انداز میں اپنا دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے ادا کیے۔

اُنہوں نے سب سے پہلے نمائندہ بزمِ سوات اور ادارہ کے وائس چیرمین محترم خورشید انور صاحب کو خطاب کی دعوت دیتے ہوئے سٹیج پر بُلایا۔ محترم خورشید انور صاحب نے اپنے یقینِ مُحکم کا اظہار کیا کہ اگر اُمتِ مُسلمہ فرقہ پرستی سے نجات حاصل کر کے مُتحد ہو گئی تو ہم سب احباب کے اسلامی حکومت کے قیام کا خواب پورا ہونے میں دیر نہیں رہے گی۔ ہمارے ادارہ سے بھی ہمارے نوجوان پوچھتے ہیں کہ ہماری قیامِ مملکت اسلامیہ کی خواہش کب پوری ہو گی جو نوعِ انسانی کے خوابوں کی تکمیل کر سکے؟ ایسا سوال لوگوں کی حالتِ زار دیکھ کر رسول کے لبوں پر بھی آتا تھا۔ اللہ کی طرف سے اُن کو یہی نصیحت کی جاتی کہ لوگوں کی حالت پر غم کھا کر اپنی جان کو ہلکان نہ کریں اور آپ اپنا تبلیغ کا کام کرتے جائیں۔ قانونِ خداوندی کے تحت لوگوں کے اعمال کے مطابق نتائج اپنے وقت پر مرتب ہو کر ظاہر ہوتے جائیں گے۔

محترم خورشید انور کے بعد سٹیج پر لاہور بزم سے ڈاکٹر عبدالرزاق تشریف لائے اور اُنہوں نے نفسِ انسانی اور قرآن کے موضوع پر طویل خطاب کیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی اعتراف کیا کہ اُنہوں نے اپنے مقالہ میں اپنی بیٹیوں کے سمجھانے پر ترامیم کی ہیں۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا کہ جب ہمارے آرمی کے چیف آف سٹاف نے بھی یہ اعلان کیا تھا کہ اُنہوں نے ڈان لیکس پر حکومت کے اقدام کو مسترد کرنے کے ٹویٹر پر اپنے پیغام کو اپنے بیٹے کے سمجھانے پر واپس لینے کا فیصلہ لیا۔ بیٹے نے اِس قدم کو سراہتے ہوئے یہ منطق بھی سمجھائی کہ ٹویٹر پر حکومت کے فیصلہ کو مسترد کرنے کا پہلا فیصلہ پاپولر لیکن صحیح نہ تھا۔ اس کے مقابل اپنے حکومتی فیصلے کو مسترد کرنے کو واپس لینے کے فیصلہ کو صحیح، لیکن پاپولر قرار نہیں دیا۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی بیٹیوں کی طرف سے پاپولر کے برعکس درست فیصلہ کی جانب راہنمائی کی گئی ہو گی۔

نفسِ انسانی یعنی انسانی ذات کے موضوع پر ہمارے احباب قرآن کے طالبعلم بیشتر وقت بات کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر حامد میاں اور محترم اعجاز رسول نے بھی اپنے مقالہ جات میں اِس کا ذکر کیا۔ میں نے بھی اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ مرتب کرتے ہوئے ہر مُمکن تحقیق سے اِس غیر مرئی ذات کی ہیئت معلوم کرنے کی کوشش کی، جو بلا کی مانند اعصاب پر سواری کر رہی تھی۔ سخت محنت اور تحقیق کے طویل مراحل طے کرنے کے بعد نظریہِ ذات کا مفہوم یوں سمجھ میں آیا کہ:

''انسانی ذات میں علم اور اختیار و ارادہ کی آزادی کی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انسان کے اندر اس مقصد کے لئے مُضمر کی گئی ہیں، کہ وہ اِن کی نشوونما کرتے ہوئے درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ ارسطو کے الفاظ میں اِسے ''actualise'' کرتے ہوئے اپنی صورت (مقصد) کا حصول کر سکے۔ یہ تمام کاوشیں اُس کے تخلیقی اعمال کہلاتے ہیں اور انہی تخلیقی غیر مرئی اعمال کا مجموعہ زمان و مکان کی جہتوں سے ماورا اُس کی ذات کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی ذات کی یہ صورت نہ تو شروع ہی سے تکمیل یافتہ ہوتی ہے نہ خارج سے متعین اور ان پر مسلط کردہ۔ انسان کے اپنے تخلیقی اعمال ہی میں اُس کی ذات کی تکمیل کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔''

مقررین اور ڈاکٹر حامد میاں نے خصوصی طور پر زور دیا کہ:

1۔ خدا کی بھی ایک ذات ہے اور اس کی عطا کردہ انسان کی بھی ایک ذات ہے۔ ذات ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible unity) ہوتی ہے، چاہے وہ خدا کی ذات ہو یا اس کی عطا کردہ انسانی ذات۔

2۔ خدا کی ذات اور خصائص مکمل ترین اور بلند ترین (الاسماء الحسنٰی) میں جلوہ بار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل انسانی ذات محدود اور سمٹی ہوئی بطور ممکناتِ زندگی کی شکل میں ہوتی ہے، جس کی نشوونما انسانی زندگی کا مقصد ہے۔

3۔ کسی نچلی سطح کی ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لئے کسی بلند ذات کو معیار بنائے۔ اسی لئے خدا کی اعلیٰ صفات کو انسان کے لئے بطور معیار سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اگر اس قسم کا معیار انسان کے سامنے نہ ہو، تو وہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں؟

4۔ خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود اور نشوونما کو زندگی کا نصب العین قرار دینا، خدا پر ایمان کہلاتا ہے۔ یہ ایمان انسان کو حیوانی سطح کی زندگی سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں، اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔

جس طرح صفات خداوندی اسماء الحسنٰی ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات میں، خدائی صفات نشوونما پا رہی ہوں، تو اس کی حفاظت کے لئے بھی حسنٰی ہونا نہایت ضروری ہے۔ جب یہ صفات صحیح صحیح تناسب کے ساتھ ایک فرد کی ذات میں منعکس ہوں گی، تو اسے متوازن شخصیت کا حامل قرار دیا جائے گا اور اگر کوئی معاشرہ اس قسم کے افراد پر مبنی ہوگا، تو ان کا معاشرہ بھی متوازن کہلائے گا۔

کسی کی طرف سے یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ صِفاتِ خداوندی کی اپنی ذات میں منعکس کرنے کی انتہا کیا ہونی چاہیے؟ علامہ اقبال نے خدائی صِفات بشری حد تک انسان کو اپنے اندر منعکس کرنے روش کو عشق کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

تیرے عِشق کی انتہا چاہتا ہوں میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

بات سمجھ میں آئی کہ عشق کی اِس روش کی کوئی انتہا نہیں اور یہ لا انتہا ہے۔

اِن کے بعد لاہور کے شکیل مُغل صاحب سٹیج پر تشریف لائے اور اپنے لئے حسبِ معمول موضوعِ سُخن انتخاب کیا کہ شادی سے پہلے کیا ہونا چاہیے؟ ہم بوڑھے لوگوں کی توجہ اِن نادر قسم کے مسائل پر سوچنے کی طرف کبھی گئی ہی نہیں۔ البتہ ہماری نوجوان نسل میں یہ صحتمندانہ روایات جڑ پکڑ رہی ہیں۔

میرے ایک قریبی عزیز کے بیٹے کی انہی دِنوں شادی ہوئی تو دو تین روز کے بعد ہی دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ وجہ پوچھنے پر جواب آیا کہ آپس میں (Click) کِلک (طبیعتی میلان) نہیں ہوسکا۔ لہٰذا کبھی سوچتا ہوں کہ ہم بھی اگر سوچتے اور عمل کرنے کی توفیق بھی حاصل کر لیتے تو کِلک کے انتظار ہی میں اب تک کے گزارے ہوئے 47 اور مزید کئی سال کیسے گزار سکتے؟

اُس کے بعد نمائندہِ بزمِ لندن محترم افتخار صاحب نے بتایا کہ اُنہوں نے از خود بچپن ہی سے میرٹ پر فکرِ طلوعِ اسلام سے متاثر ہوکر علم کی کمی کے باوجود بہت سی روکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے قرآنی علم کے میدان کو سمجھنے میں آگے بڑھنے کا سفر جاری رکھا۔ اُن کی کہانی سُن کر مَیں سمجھتا ہوں کہ افتخار صاحب نے حصولِ علم میں ہر مُمکن کوشش کرتے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کی صحیح پیروی میں قرآن پر غور و فکر اور تدبر کرتے ہوئے ایمان لانے کا حق ادا کر دیا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108)

کہو: یہی میری (رسولؐ کی) راہ (سنت) ہے کہ میں تمہیں اللہ کے کلام کی طرف دعوت علی وجہ البصیرت دیتا ہوں، اور جو میرے متبعین ہیں، وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

قرآن کی رو سے ''عَلٰي بَصِيْرَةٍ'' قوانین خداوندی کو اپنے سامنے وہی رکھ سکتا ہے، جو يَّعْقِلُوْنَ ۝ (13:4)، يَعْلَمُوْنَ ۝ (2:101)، يَشْعُرُوْنَ ۝ (2:9)، يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (13:3)، اور تُوْقِنُوْنَ ۝ (13:2) وغیرہ کی صِفات رکھنے کے اہل ہوتے ہیں سورہ الرعد 19 میں واضح کر دیا ہے کہ اِنہیں قرآن اولی الالباب کہتا ہے۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (13:19)

(قرآن) عقل کا نچوڑ رکھنے والوں کے لئے ذکر ہے۔

اِنہی سے ملتے جُلتے انداز میں محمد ظفر اقبال نے سٹیج پر آکر بتایا کہ وہ بھی علمی، تحقیقی اور منطقی اصولوں سے قرآن کو پرکھ کر ایمان لائے ہیں۔

اُس کے بعد محترمہ ڈاکٹر طاہرہ اکرم مرزا سٹیج پر تشریف لائیں اور اُنہوں نے قرآن میں عورت کے مقام کو موضوعِ سُخن بنایا۔ اُنہوں نے قرآن میں عورت کے لئے رزق پہنچانے کے فریضہ قوامون سے مرد کے عورت سے بلند درجہ رکھنے کے عمومی نظریہ کو بُہت سے دلائل دیتے ہوئے سختی سے مسترد کر دیا۔ مُحترمہ ڈاکٹر صاحبہ کہہ تو صحیح رہی ہیں، لیکن اِس کا کیا کیا جائے کہ

ہماری آغاز سے لے کر ڈاکٹریٹ تک کی سبھی نصابی کُتب میں لفظ قوامون کا ترجمہ ہی مستطرین بمعنی داروغہ اور مسلطین بمعنی حاکم جلی حروف میں لکھا ہوا مِلتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ قرآن میں مرد وزن کی یکساں پوزیشن کے عنوان سے میرا ایک تحقیقی مقالہ دو درجن قرآنی حوالہ جات کے ساتھ اسی سال چھ سات قسطوں میں طلوع اسلام میں شائع ہوتا رہا ہے۔ قوامون پر آپ کا ہی عربی زبان کے قوائد کی مطابقت لئے موقف رکھنے پر مجھے اعتراضات کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے ایک چوہدری صاحب آج تک مُجھ سے اختلاف کرتے ہوئے بار بار صِرف رزق پہنچانے کی ذمہ داری تفویض ہونے کی بنا پر مرد کو حاکم کا درجہ دینے پر اصرار کرتے رہے۔ میرے درجِ ذیل کے جواب سے بھی مطمئن نہ ہو سکے کہ:

مرد کا عورت کو رزق پہنچانے کے فریضہ کی بنا پر عورت کو کمتر قرار دینے کی دلیل ہی بِلا جواز ہے، کیونکہ عورت تو بچے کی پیدائش سے قبل اور پیدائش کے زمانۂ آغاز ہی سے اُس کو دودھ پِلا کر زندہ رکھ رہی ہوتی ہے۔ وہ تو عمر کی آخری منزل پر پہنچ کر کے بھی اپنے لُقمے بچوں کے مُنہ میں ڈال دیتی ہے۔

اُن کے بعد ملتان سے ملک محمد صفدر سٹیج پر تشریف لائے اور ہمارا زوال کہاں سے شروع ہوتا ہے کا تجزیہ پیش کیا۔ اُنہوں نے اس کی بنیادی وجہ عدمِ تنظیم بتلایا۔ تنظیم کی تلقین قائدِ اعظم بھی بار بار کرتے رہتے تھے، لیکن فرقوں میں بٹی ہوئی اسلامی ریاستوں نے کبھی اس کو اہمیت نہیں دی۔ اسی بنیادی وجہ سے ہی ہم ہمہ جہت زوال کا شکار ہو رہے ہیں۔

اُن کے بعد ٹرسٹ کے رکن محترم عابد بشیر نے اپنی طبیعی معذوری کے باوجود شرکت کر کے ادارہ کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا، جسے بہت سراہا گیا۔

اُن کے بعد ہمارے قرآنی فِکر سے خالد فاروقی صاحب کی بیٹی عافیہ فاروقی نے سٹیج پر آ کر عِلم کے ساتھ عمل کرنے کی لازمی ضرورت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ عمل بامقصد کے بیان میں وہ علامہ اقبال کی ترجمانی ہی میں شکایت کرتے دِکھائی دے رہی تھی کہ ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

اپنی بیٹی کے پیچھے پیچھے اُن کے والد بزمِ لاہور سے وابستہ دیرینہ ساتھی خالد فاروقی بھی سٹیج پر تشریف لائے۔ اُن کے اِس پیچھے آنے کے عمل سے ڈاکٹر طاہرہ صاحبہ کا شکوہ کم از کم اس حد تک تو دور ہو جانا چاہیے کہ کچھ قرآنی فِکر کے لوگ صنفِ نازک کو نہ صِرف برابری کا بلکہ اپنے سے مقدم درجہ دیتے ہیں۔ محترم خالد فاروقی نے حساس ترین مسئلہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کی اطاعت کو اسلامی حکومت کی اطاعت سے منسوب کر دیا۔ اُنہوں نے یہ وضاحت کر کے مکتبِ مُلا کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی مسئلہ کے بنیادی حل کی نشاندہی پر علامہ پرویز صاحب کو ایک ہزار سے زائد عُلمائے کرام کی

طرف سے کافر کے فتویٰ سے نوازا گیا تھا۔ لہٰذا اِسے خالد فاروقی صاحب کی طرف سے مکتبِ مُلا کے خلاف اعلانِ جنگ یعنی head on collision کا آغاز ہی قرار دیا جائے گا۔

اُس کے بعد بزمِ فیصلِ آباد کے نمائندہ محترم عقیل حیدر صاحب سٹیج پر تشریف لائے اور علامہ پرویز کی مرغوب نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کا کلامِ اقبال سے پڑھ کر بڑے جوش وولولہ سے بھرپور گونجدار آواز میں پیش کیا۔

عقیل حیدر کے بعد لاہور بزمِ خواتین کی نمائندہ ڈاکٹر صالحہ نغمی نے اپنی والدہ کا لکھا ہوا مقالہ پاکیزہ روٹی کا اہتمام پڑھ کر سنایا۔ قرآن ایسی پاکیزہ روٹی کو رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ اُنہوں نے واضح کر دیا کہ رزقِ کریم کا مِلنا صِرف قرآنی معاشرہ ہی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ لہٰذا غیر قرآنی معاشرہ میں رہنے کی بِنا پر ہمارے اور آپ سب کے لئے خوشی محسوس کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اُن کے بعد لاہور ہی کی معتبر ہمارے اور خصوصی طور پر ہمارے قابل سٹیج سکریٹری کے دوست اور اُستاد کا درجہ رکھنے والی شخصیت محترم ڈاکٹر فریدالدین سٹیج پر تشریف لائے اور چند اہم نکات ہم سب کی بہتری کے لئے بیان کئے۔ بنیادی نقطہ توحید پر بھی بات کی۔ اُنہوں نے بزرگِ محفل ہونے کے ناطے سے چند ناصحانہ جُملے بھی ادا کئے، جنہیں خاموشی اور ادب سے سُنا گیا۔

اُن کے بعد گلاسکو کے نمائندہ اعجاز رسول صاحب تشریف لائے اور اُنہوں نے اپنی کتاب what is Islam کا تعارف کرایا۔ اُنہوں نے دوٹوک اعلان کیا کہ اسلام کے اصولوں کو اپنا کر ہی ہم زندگی سنوارتے ہوئے اپنی شناخت بنا سکتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر حامد میاں سٹیج پر تشریف لائے اور اپنے گزشتہ روز کے دیے گئے طویل خطاب کو آگے بڑھایا۔ اُن کے خطاب کا مرکزی خیال انسانی ذات اور اُس کی نشوونماء سے ارتقاء کرتے ہوئے حیات بعدالحیات کا اُمیدوار بننے کی صلاحیت کا حصول تھا۔ وہ عصرِ حاضر کے علمی، منطقی اور تحقیقی پسِ منظر سے حقائق کے پردے اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ انداز فلسفیانہ تھا، اِس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سبھی کو convince کر سکے یا نہیں۔ البتہ جو convince نہیں ہو سکے ہوں گے، اُن میں doubt پیدا کرنے میں ضرور کامیاب رہے۔

کنونشن کے اختتام سے پہلے ہمارے بزمِ لاہور کے سابق نمائندہ محمد اشرف ظفر نے علامہ پرویز کے ہفتہ وار دروس کی کتابی شکل میں تکمیل ہونے کی نوید سنائی۔ حاضرینِ مجلس نے اُن کی مُخلصانہ کاوشوں کو سراہتے ہوئے خوشی سے دِل بھر کر داد دی۔ اُنہوں نے اِس موقعہ پر دروس کی آخری جِلد کی ایک کاپی بھی اپنے ہاتھوں صدرِ مجلس ڈاکٹر انعام الحق کو عنایت کی۔

کنونشن کے اختتام پر لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا اور بقول سٹیج سیکرٹری کھانے میں Quality اور Quantity کے بھرپور جوبن پر رکھنے کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ بقول مرزا غالب آم میٹھے بھی تھے اور بُہت بھی تھے۔

کنونشن کے بعد بھی لوگ بڑی دیر تک ہال میں گھومتے ہوئے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ گروپ فوٹو اور سیلفیاں بناتے ہوئے یادگار لمحات کو محفوظ کرتے رہے۔ وہاں ہال میں شُرکاءِ کنونشن کے بیٹھنے، گفتگو کرنے اور کھانے کے دوران شائستگی نظم وضبط قابل دید تھا. وہاں سبھی مُلکی وغیر مُلکی سامعین کے تاثرات کا سماں محترم سید عطاء الرحمان نے فیس بک پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑی خوبی سے یوں باندھا ہے کہ:

''سبھی سامعین کے بیٹھنے، گفتگو کرنے اور کھانے کے دوران شائستگی نظم وضبط قابل دید تھا۔ سٹیج پر آ کر ملکی وغیر ملکی شخصیات نے اپنے تاثرات بیان کیے کہ کس طرح پرویز صاحب کی فکر قرآنی سے متاثر ہو کر ان کی شخصیت و کردار کی تعمیر ہوئی ان کے اندر تغیر نفس پیدا ہوا اور ان کے رویہ میں مثبت تبدیلی آئی اور وہ تعمیری سوچ و کردار کے حامل کارآمد انسان بنے۔

اس کے باوجود پورے کنونشن میں مفکر قرآن پرویز صاحب کے متعلق شخصیت پرستی یا مبالغہ آرائی یا جذباتیت کا ذرا سا بھی کسی قسم کا کوئی جذبہ یا عنصر نہیں دیکھا گیا۔''

واقعی پرویز صاحب نے شخصیت پرستی مذہبی عقیدت اعتقاد اور مبالغہ آرائی مذہبی جذباتیت وجنونیت کے خلاف بڑا جہاد کیا اور علم وتحقیق، تہذیب وشائستگی قرآنی اقدار کی رو سے انسانی شخصیت و کردار اور انسانی رویوں کو تعمیری بنانے میں اپنی زندگی وقف کر دی. انہوں نے فرقہ پرستی، شخصیت پرستی، روایت پرستی اور مذہبی عقیدت کے بت پاش پاش کر دیئے اور لوگوں کو خالص قرآنی توحید کے ذریعے متحد Integratd قوم بننے کی ترغیب دی۔

آج ان کی یہ نہایت پرامن انقلاب آفرین فکر قرآنی اپنا رنگ لا رہی ہے. خالص قرآن کی جو پُرخلوص آواز انہوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک بلند کی آج وہ ملکی وغیر ملکی سطح پر پھیلتی اور مزید بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور متلاشیانِ حق کے سینوں کو نورِ قرآنی سے منور کرتی چلی جا رہی ہے۔ علم وعمل کے پیاسوں کی پیاس بجھا رہی ہے۔ لوگوں کو خالص قرآنی اقدار پر اپنی شخصیت کی تعمیرِ نو کرنے اور اپنے رویہ میں قرآنی فکر کو سمونے کا محرک Stimuli بن رہی ہے۔

آخر میں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میرے ذمہ ادارہ کی طرف سے یہ فریضہ عائد کیا جاتا ہے کہ مَیں کنونشن کی کاروائی کا احاطہ کرتے ہوئے خُطبہ صدارت میں اِس پر تبصرہ پیش کروں۔ عمومی طور پر تبصرہ دو قسم کا ہوتا ہے۔

ایک تعریفی اور دوسرا تنقیدی:

ایسی تقریبات کے اختتام پر عمومی طور پر پہلی قِسم کے تعریفی تبصرہ کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ادارہ کی پالیسی میں یکطرفہ روش کو کبھی اپنایا نہیں جاتا۔ لہٰذا ادارہ ہی کی پالیسی کے تحت میری طرف سے تعریفی اور تنقیدی دونوں زاویہِ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ اکرم، گجرات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عورت کا مقام قرآن کی نظر میں

(کنونشن کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

قرآن میں آدم یعنی آدمی کو نوعِ انسان کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کی رو سے زندگی کی ابتداء ایک لائف سیل (Life Cell) خلیہ حیات سے ہوتی ہے جو آگے چل کے خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک مادہ اور ایک نر پھر اُن کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے مرد اور عورت میں پیدائش کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں۔ دونوں کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ قرآن کا بنیادی اصول جس پر تمام عمارت استوار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے کسی انسانی بچے میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ خدا نے جس تعظیم اور تکریم کا حامل انسان کو ٹھہرایا ہے اس میں تمام انسان شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے جو کچھ الناس یعنی انسان کے لئے کہا ہے اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی لڑکا اپنے اختیار اور ارادے سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکی اپنے انتخاب سے لڑکی۔ اب لڑکی یعنی عورت کو لڑکا یعنی مرد سے کسی بھی اعتبار سے پست یا inferior سمجھنا پیدائشی تفریق کے اُس باطل عقیدے کی طرف لوٹ جانے کے مترادف ہے جس کو مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ قرآن کی رو سے افضلیت جوہرِ ذاتی یعنی حسنِ سیرت اور اعمال سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ پیدائش کی رو سے اور اس اُصول میں بھی مرد اور عورت دونوں شامل ہے۔ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر اُن میں توازن پیدا کیا جائے۔ (جیسے میرے سے پہلے جتنے بھی مقرر تھے اُنہوں نے انتہائی خوبصورتی سے یہ بیان کیا ہے) اس سے اُس معاشرے میں توازن پیدا ہوگا۔ پھر انسان اور کائنات کی قوتوں میں توازن پیدا کیا جائے، برابر برابر مرد اور عورت دونوں کی زندگی میں۔ انسانی زندگی میں جو ناہمواریاں ہمیں نظر آرہی ہیں اُن کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ مرد نے اپنے ہی آدھے حصہ کو پورا انسان سمجھ رکھا ہے جس سے نہ تو زندگی کا کوئی نقشہ بنتا ہے اور نہ تو اُس کو کوئی توازن نصیب ہوتا ہے اور نہ ہوگا۔ قرآن اس توازن کے لئے کیا نقشہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم کائنات میں غور کرو ہر جگہ تقسیمِ کار کا اُصول نظر آئے گا۔ سورج کا کام حرارت پہنچانا ہے، پانی کا کام ٹھنڈک اور نمی دینا ہے، ہوا کی اپنی الگ خصوصیات ہیں اور مٹی کی اپنی الگ لیکن بیج کی نشوونما کے لئے ان سب مختلف اور متفرق قوتوں کا امتزاج ضروری ہے اس امتزاج میں ہر قوت کا اپنا اپنا حصہ اپنا اپنا فریضہ ہے اور اس تقسیمِ کار میں کسی ایک قوت کو دوسری قوت پر فضلیت حاصل نہیں ہے اور نظامِ کائنات میں نظام کو چلانے کے لئے ہر قوت کی ضرورت ہے اور اپنا اپنا مقام، اور ان کے باہمی امتزاج یعنی ملنے سے مقصد یہ

ہے کہ جو کمی کسی ایک عنصر میں ہے اُسے دوسرا عنصر پوری کردے جو کچھ خارجی کائنات میں ہو رہا ہے وہ ہی انسانی معاشرے میں مقصود ہے۔ یہاں بھی تقسیمِ کار کا اصول کارفرما ہے۔ انسانی دنیا میں دو ہی عناصر ہیں مرد اور عورت ان میں بہت سی بنیادی اور مشترک خصوصیات ہیں لیکن کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں۔

قانونِ کائنات کے مطابق یہاں بھی ایک کی کمی کو دوسرے کی رفاقت پورا کردیتی ہے۔ مرد اور عورت میں بیشتر خصوصیات یہ ہیں یعنی عقل اور بصیرت کا استعمال، قانونِ خداوندی کی اطاعت، اپنی استعداد کا صحیح استعمال، اپنے دعویٰ ءایمان کو سچا ثابت کرنے کی صلاحیت، ثابت قدمی، ایثار، کنٹرول، جنسی خواہشات کو مکمل پابندی میں رکھنا، قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنا، یہ سب دونوں میں مشترک اور ایک جیسی ہیں اب عورت کی منفرد خصوصیات، عورت کو حیاتی طور پر یعنی biologically اس طرح بنایا گیا ہے کہ جس میں بچے کی تولید اور پرورش کے لئے ایسی خصوصیات رکھ دی گئی ہیں کہ جس سے مرد محروم ہے۔ عورت کی یہ خصوصیات معاشرے کی بنیادی ضرورت اور مرد کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتی ہیں اس اعتبار سے عورت کا درجہ مرد سے فائق ہے۔ بچہ کی تربیت ماں کی گود میں ہوتی ہے جس قسم کی اُس کی تربیت ہوگی اُسی قسم کا وہ بچہ بنے گا اور جس قسم کے قوم کے بچے ہوں گے اُسی قسم کی وہ قوم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان اور خود قرآن مجید میں قوم کے لئے اُمت کا لفظ آیا ہے اور لفظ اُمت کا مادہ اُم ہے جس کے معنی ہے ماں لہٰذا قرآنِ کریم کی رو سے اُمت / قوم کی تخلیق اور تشکیل کی ذمہ داریاں ماں کی ہیں۔ ذرا سوچو کہ اس اعتبار سے عورت کتنی بڑی ذمہ داریوں کی حامل اور کتنے عظیم مقام کی مالک ہے لیکن جب عورت اس عظیم کام یعنی تولید اور تشکیلِ اُمت میں مصروف ہے تو مرد اکتسابِ رزق کررہا ہے اور اُس کی دوسری کمی یعنی احتسابِ رزق کو پورا کررہا ہے۔ اب چونکہ مرد کماتا ہے تو یہ کمائی عورتوں پر اُس وقت تک صرف ہوتی ہے جب تک اُن کے حالات اُنہیں اکتسابِ رزق کرنے کی اجازت نہ دیں تو مرد یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس کو عورت پر فضیلت حاصل ہوگئی اور یہ سوچ معاشرے کی ناہمواری کی وجہ ہے۔ اور اس خود ساختہ معیارِ فضیلت کو اس حد تک کھینچ لیا گیا ہے کہ عورت کے دل میں رہ رہ کر سوال اٹھتا ہے کہ میں عورت کیوں بن گئی مرد کیوں نہ بنی۔ حالانکہ سوچ اور خیال یہ ہونی چاہئے کہ دونوں مرد اور عورت یہ آرزو شدت سے کیا کریں کہ جو بھی اُن کا میدانِ عمل ہے خدا اُسے پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور توفیق دے۔ بدقسمتی سے قرآن کی صحیح تعلیم کو نہ پھیلانے سے خاص طور پر مسلم اُمہ آج کل جس اخلاقی اور ذہنی پستی کا شکار ہے اُس کا حل عورت کی قرآنی اور دنیاوی تعلیم میں ہے اور اُسے اُس کا وہ مقام دینے میں ہے جو قرآن نے اُس کو دیا تھا یعنی اُمت کی ماں۔ اُمت کی بہتری اس صورت میں ممکن ہے کہ جب مائیں قرآنی اور دنیاوی تعلیم دونوں میں با صلاحیت ہوں گی۔ عورتوں کو جاہل رکھ کر اُن پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرکے بدقسمت قوم اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا مار رہی ہے۔ میری بہنو اور بیٹیو! آؤ ہم سب مل کر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی مدد کریں اور خاص طور پر یہ عہد کریں کہ ہم سب آپس میں بہنیں اور ہم مقصد بن کر رہیں گی کیونکہ ہم سب ایک ہی مٹی سے بنی ہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں ہر ایک کے لئے رزق بھیجا ہے آؤ ہم سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس اکتسابِ رزق میں اپنی اُن بہنوں اور بیٹیوں کی مدد کریں جو نامناسب حالات کا شکار ہیں اور اُنہیں اُن کے پاؤں پر کھڑا کریں اور آنے والی نسلوں کا مستقبل سنواریں۔ آمین شکریہ

ملک محمد صفدر فیضی، ایڈووکیٹ، ملتان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دین اسلام کا ابتدائی تنظیمی نظام

(کنونشن کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

تنظیم کی اہمیت:

دنیا کی سب سے خوفناک طاقت تنظیم ہے۔ کسی تحریک، فکر، پارٹی اور دعوت کی کامیابی اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک اس میں تنظیم نہ ہو۔ کئی سکالرز کی کتب میں گہری تحقیق کے بعد مسلمانوں کے زوال کے اسباب تحریر ہوئے ہیں لیکن ان میں درج زوال کی وجوہ میں، عدم تنظیم کا شاذ ہی ذکر ہوا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی دنیا میں سب سے بڑی کمزوری ہی یہ ہے کہ ان میں سے تنظیم کا تصور ہی عنقا ہو گیا ہے۔ دین اسلام تنظیم سکھلاتا ہے۔ اس کی تاکیدی اور حکمی دعوت الصلوٰۃ کا عملی مطلب ایک تنظیم میں نہ صرف شمولیت ہے بلکہ باقاعدگی سے کچھ اعمال وافعال کی بجا آوری بھی ہے۔ جب کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ خود بخود ایک تنظیم کا ممبر بن جاتا ہے۔

تنظیم کی ابتدا:

اسلام اپنی تنظیم کی ابتدا نہ صرف نئے پیدا ہونے والے بچے کے کان میں اذان کہنے سے اور پیدائش کے ساتھ ہی روزینے مقرر کر دینے سے کرتا ہے بلکہ وہ تو تب سے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ بچہ ابھی رحم مادر میں ہو۔ قرآن مجید تو بات ہی "من علق" سے شروع کرتا ہے۔ وہ مسلمان بچہ جو ابھی پیدا ہونے والا ہے اس کے لئے عدت کے قوانین دیتا ہے۔ فقہاء نے قوانین کا یہاں تک استنباط کر کے رکھ دیا کہ کیا اس بچے کو جائیداد تملیک ہو سکتی ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔ یہ تنظیم کی ابتدا ہے کہ ابھی وہ بچہ جس نے پیدا ہونا ہے اسے بھی نہ بھولا جائے۔

نظریہ اعلون:

قائداعظم نے فرمایا تھا، اتحاد، تنظیم اور یقین محکم۔ مگر خود کو کسی تنظیم، مذہبی فرقہ، سیاسی جماعت، یا کسی نظریاتی وفلاحی تنظیم سے وابستہ کر کے سمجھ لینا کہ میں کسی تنظیم میں ہوں، یہ خام خیالی ہے۔ جیسے پولیس، عدلیہ، یونیورسٹی ایک ایک ادارہ ہیں، بالکل اسی طرح اسلامی معاشرہ ایک ادارہ ہے، جو ایک ''ون یونٹ'' ہے جس کا ہر مسلمان، خلیفہ وقت سے لیکر کسی بھی مسلمان رحم مادر میں غیر مولود بھی اس کا رکن ہوتا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات میں فرقہ بندی کی کوئی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن مجید فرقہ بندی کو شرک کہتا ہے۔ وہ صرف ایک ''ون یونٹ'' تنظیم قائم کرتا ہے جو دنیا کی سب سے خوفناک و برتر طاقت بن جاتی ہے اور پھر ساری کائنات کی شیطانی قوتیں اس سے مات ہو جاتی ہیں اور مومن ہی دنیا کی غالب قوت بن جاتا ہے جسے قرآن مجید اعلون کہتا ہے۔ چشم فلک اور انسانی تاریخ ایک ایسے ہی دور کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ قرآن مجید جو تنظیم، حزب اللہ

وجود میں لاتا ہے اور جس طرح سے اسے کارہائے نمایاں دکھانے کا حکم ملتا ہے اسے سورۃ صف آیت 4 میں بنیان مرصوص یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا گیا۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139)

''اور بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن ہو تو تم ہی اعلون ہو گے۔''

کیا ہم مومن نہیں رہے:

مگر آج کی صورت احوال یہ ہے کہ اعلون یعنی اعلیٰ ہونا تو درکنار مسلمانوں کا شمار ادنیٰ میں بھی کوئی نہیں کرتا۔ مگر کیوں؟ جواب سادہ ہے کہ ہم اللہ کے معیار کے مومن نہیں رہے۔ ہم اپنے زعم میں جتنی نیکیاں بھی کر لیں، اگر ہمارے درمیان تنظیم نہیں تو حی علی الصلوٰۃ کے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔

بعثت نبوی کے وقت یثرب وخیبر کے یہودیوں، نجران ویمن میں کچھ عیسائیوں اور یمن و بحرین کے کچھ آتش پرستوں کے علاوہ باقی ماندہ سارا عرب اور قریش ابھی تک ملت ابراہیم کا فرد ہونے کے دعویدار تھے۔ بت پرستی اور دیگر معاشرتی قباحتوں کے باوجود، بزعم خود، دین وشریعت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ الصلوٰۃ والزکوٰۃ سے بھی واقف تھے، حج بھی کرتے اور قربانی بھی، قریش تو اولاد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہونے کے ناطے خانہ کعبہ کے متولی بھی تھے حاجیوں کو پانی پلاتے، کھانا کھلاتے، احرام فراہم کرتے، رہائش بھی مہیا کرتے مگر اللہ نے اسے بیکار گردانا۔ کعبہ کے قریب ادا کی جانے والی ان کی الصلوٰۃ کو محض سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا قرار دیا۔ وہ الصلوٰۃ والزکوٰۃ سے واقف ہونے کے باوجود ان اعمال کے تارک ہی نہ تھے بلکہ ان اعمال کی حقیقت بھول چکے تھے اس لئے ان کی بزعم خود نیکیاں اور عبادتیں سب رائیگاں قرار دے دی گئیں۔ کیونکہ وہ اب مومن نہیں رہے تھے۔

انفرادی کوششیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ راز بیان کیا ہے کہ اے انسان تمہارے مسائل اس لئے ہیں کہ تم ''اک لسر'' ہو۔ یعنی ایسا انسان جس کا کوئی حقیقی مددگار یا معاون نہ ہو اور وہ اپنا کام کرنے کے لئے اکیلا وتنہا ہو۔ سورۃ لیل میں ارشاد ہوا: ''اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿۴﴾'' (92:4) تم لوگوں کی کوشش علیحدہ علیحدہ کی ہے۔ یعنی انفرادی ہیں۔ قرآن مجید انسان کی انفرادی کوششوں کی نفی کرتا ہے اور تنظیم کا درس دیتا ہے۔

فرد واحد سے:

قرآنی تنظیم کی ابتداء ایک سے ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبول کیا تھا کہ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ (7:143) میں ایمان لانے والوں میں سب سے اول ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے والے ساحرین نے بھی کہا تھا: وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ (7:143) اس لئے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید میں فرمایا گیا:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (6:14) کہہ دو کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں۔ پھر ارشاد خداوندی ہوا کہ کہو: وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ (6:163)

پھر فرمایا کہ کہہ دو: وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿12﴾ (39:12) مجھے حکم ملا ہے کہ اول المسلمین بنوں۔ تو گویا آغاز ایک سے ہو رہا ہے۔

مثنیٰ یعنی دو:

ارشاد خداوندی ہے: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46)

''تم خدا کے لئے دو دو اور ایک ایک کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو'' یہاں الفاظ استعمال ہوئے مثنیٰ و فرادیٰ، یعنی دو یا اکیلے۔ سورۃ المزمل میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ''يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿1﴾'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ مزمل کا مطلب ہے عمل تزمیل کرنے والا، یعنی ایک جیسی استعداد، میلان اور صلاحیتیں رکھنے والے دو اشخاص کے جوڑے بنانے والا۔ مواخات مکہ اور مواخات مدینہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

الثلاثہ یعنی تین کی جماعت:

آیئے اب تین کی طرف بڑھتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان مسند امام احمد ابن حنبل میں موجود ہے:

''تم میں سے اگر تین مسلمان کسی جزیرے میں ہی رہ رہے ہوں تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر مقرر کر لیں''۔ (بحوالہ معراج انسانیت از علامہ غلام احمد پرویز، ص:335)

گویا ایک اور دو کے بعد جب تین ہو جائیں تو جماعت بن جاتی ہے۔

ایک گھر:

ابتدائی تنظیم کا ایک درجہ گھر بھی ہے جس طرح کم از کم تین افراد پر مشتمل تنظیم کا بھی ایک امیر ہونا چاہیے اسی طرح گھر کا سربراہ بھی اپنے گھر کا امیر ہوتا ہے۔ قرآن مجید حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام لیتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو الصلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اللہ کے ہاں پسندیدہ تھے۔ اس کے لئے سورت مریم کی آیات 54 اور 55 ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی تعریف فرمائی گئی۔ سورۃ احزاب میں يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ (33:32) کہہ کر ازواج مطہرات کو جو خطاب ہوا آیت 34 میں ان الفاظ میں اس کا اختتام ہوتا ہے: وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿34﴾ (33:34) اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جن آیات و حکمت کا بیان ہوتا ہے ان کو یاد رکھو۔ بے شک اللہ لطیف و خبیر ہے۔

دو گھر:

قرآن مجید کی روشنی میں، تاریخ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک گھر کے بعد دو گھروں کے تعاون کی مثال ملتی ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات انما المومنون اخوۃ، کی پہلی مثال مواخات مکہ اور دوسری مثال مواخات مدینہ ہے۔ دو مسلمانوں کی مواخات دراصل دو گھروں کی بھی مواخات تھی۔ اس سے اگلی منزل مسجد ہے۔

مسجد:

آج ہو سکتا ہے کہ مسلمان خدانخواستہ ایسے معاشرہ میں رہ رہے ہوں کہ جہاں وہ اقلیت میں ہوں یا ایسے ملک و معاشرہ

میں رہتے ہوں جہاں ان کی حکومت نہ ہو اور اگر حکومت ہو بھی تو وہ قرآنی اصولوں کے مطابق تشکیل نہ پائی ہو بلکہ مسلمانوں کی غیر قرآنی حکومت ہو۔

اگر آپ کسی غیر اسلامی ملک میں رہائش پذیر ہیں مگر وہاں مسجد موجود ہے یا دوسری صورت کہ آپ اسلامی ملک کے باشندے ہیں اور وہاں مساجد موجود ہیں تو پھر یہ تنظیم ہر مسجد کی سطح پر ہو جانی چاہیے۔

لوکل گورنمنٹ:

دنیا میں جو لوکل گورنمنٹ کے نظام کا نظریہ ہے اس کی سب سے نچلی سطح، بجائے وارڈز اور بلاکوں میں تقسیم کرنے کے، مسجد اور اس کے گرد و نواح کی آبادی ہو سکتی ہے۔ علم سیاسیات کے ماہرین کے مطابق لوکل گورنمنٹ کا تصور قدیم یونان کی شہری ریاستوں کی نظیر ہے۔ سمرنا، ایتھنز، مقدونیہ اور بے شمار دوسری ریاستیں جنہیں پہاڑ اور دریا تقسیم کرتے تھے ان کا اپنا اپنا شہری انتظام تھا جس کے بارے میں اب یہ قرار پایا ہے کہ مقامی انتظام کے لئے مقامی حکومت ہونی چاہیے۔

آج جرمنی کے آئین کی مثال دی جاتی ہے کہ ان کے آئین 1994 کے مطابق وہاں کا ہر قریہ خود مختار ہے جو قانون سازی کر سکتا ہے، ٹیکس لگا سکتا ہے۔ اپنا ترقیاتی منصوبہ بنا سکتا ہے اگرچہ پاکستان میں بھی بلدیاتی نظام موجود ہے مگر ہماری مقامی حکومتیں، صوبائی حکومت کے ماتحت ہوتی ہیں اور مزید یہ کہ کوئی قانون سازی نہیں کر سکتیں۔

اسی طرح دنیا میں فلاحی ریاست کا بھی بہت چرچا ہے۔

مقامی حکومتیں، فلاحی ریاستیں اور مساجد:

قرآن مجید نے جو نظام الصلوٰۃ دیا اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ نے متشکل کیا تھا اس میں مقامی حکومتوں کی سپرٹ اور فلاحی ریاست کا نظریہ دونوں باہم مدغم اور تشکیل پذیر ہو گئے تھے اور ان کی بنیاد پہلے مواخات تھی اور پھر مساجد تھیں۔ قیام الصلوٰۃ و ادائیگی زکوٰۃ، اس نظام کے مظہر تھے۔ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے الفاظ اسی نظام کا ''ہوکا'' اور ماٹو ہیں۔ مگر پھر گاڑی پٹڑی سے اتر گئی جو اب تک اتری ہوئی ہے۔ حکومتی سطح پر قانون سازی کر کے اسے دوبارہ پٹڑی پر چڑھایا بھی جا سکتا ہے۔

مساجد: اولین تنظیمی مراکز:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قرآن مجید کے پیغام کی تبلیغ شروع کی تو جو اسے قبول کر لیتا اس کے نتیجے میں دو مسلمانوں میں عمل تزمیل کے مطابق مواخات کروا دی جاتی، اس کے علاوہ مسلمانوں کی تربیت کے لئے مخصوص جگہوں کا انتخاب ہوتا۔ یہ جگہیں دوستوں کا گھر ہوتیں، بعض اوقات غیر مسلم دوستوں کے گھر بھی اس مقصد کے لئے استعمال ہوتے رہے۔ گھروں میں ایسے ممتاز گھر، آپ کا اپنا حضرت خدیجہ والا گھر۔ آپ کے چچا جناب ابو طالب کا گھر، حضرت ابو بکر صدیق کا گھر اور دار ارقم وغیرہ تھے۔ یہ سارے گھر قبلہ تھے جس طرح بحوالہ سورت یونس آیت 87، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا تھا کہ مصر میں بنی اسرائیل کے کچھ گھروں کو قبلہ قرار دے لو، بالکل اُسی طرح وہ گھر بھی جن کا نام لیا گیا ہے، مکی دور کے مسلمانوں کا قبلہ تھے، تربیت گاہیں تھیں اور جہاں الصلوٰۃ کا قیام ہوتا تھا۔ مکہ میں جب تک اسلامی دعوت کی مخالفت نے عروج

نہیں پکڑا تھا، صحن کعبہ بھی ان مقاصد کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ جس تنظیم کی ابتدا خانہ کعبہ سے ہوئی تھی وہ آج میرے محلہ کی مسجد تک موجود تو ہے مگر موثر نہیں رہی۔ حی علی الصلوٰۃ پر مسلمان کا کسی حد تک عمل ہے مگر بغیر تنظیم کے اور حی علی الفلاح، یعنی فلاح، بہبود، ویلفیئر کی عملی تعبیر کہیں نظر نہیں آتی۔

مکی دور میں ہی مساجد وجود میں آنے لگی تھیں۔ اس کی ابتدا بالاءِ مکہ کا نشیبی گوشہ تھا جہاں طہارت وصلوٰۃ شروع ہوئی۔ بحوالہ تاریخ ابن ہشام۔ آپ کا اپنا گھر، بیت صدیقی، کاشانہ عمار بن یاسر، وادی منیٰ، مکہ کی مختلف وادیوں کی مساجد، جیسے نخلہ محمود، نخلہ شامیہ اور نخلہ یمانیہ کو مساجد النبی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ مسلمانوں کے ابتدائی تنظیمی و تربیتی مراکز تھے۔

(بحوالہ کتاب مکی اسوہ نبوی از پروفیسر محمد مظہر یٰسین صدیقی، علی گڑھ)

اس کے بعد مدینہ اور دوسرے مقامات پر مساجد وجود میں آئیں۔ محلوں کی مساجد کا تعلق جامع مساجد سے قائم ہوا۔ جو اسلامی تنظیم کا اگلا درجہ تھا۔ اور پھر یہی نظام پورے عرب میں پھیلا دیا گیا تھا۔ جہاں نظام الصلوٰۃ والزکوٰۃ پوری آب وتاب کے ساتھ جاری ہوا تھا۔

الصلوٰۃ والزکوٰۃ:

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان کی الصلوٰۃ ہی تنظیم ہے۔ وہی الصلوٰۃ جو منافق پر بھاری ہے، لبرل جس کا مذاق اڑاتے ہیں اور زندیق بقول شاہ ولی اللہ جن کی کھوپڑی الٹی فٹ ہو وہ اس سے مطلق انکاری ہیں۔ قرآن مجید نے مشرکین کے لئے اعلان کیا تھا کہ اگر وہ اقامت الصلوٰۃ کر لیں اور زکوٰۃ دینے لگیں یعنی اسلام کا تنظیمی نظام قبول کر لیں تو ان کا راستہ چھوڑ دیں:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (9:5)

جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور الصلوٰۃ قائم کر لیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ غفور ورحیم ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ

''اگر یہ توبہ کر لیں اور اقامت الصلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ کرنے لگیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔'' (9:11)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ دین اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل ہیں اور دین اسلام کا امتیازی نشان ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بغیر تنظیم کے الصلوٰۃ بے نتیجہ ہو جاتی ہے اور بغیر الصلوٰۃ کے تنظیم میں روح اور خلوص نہیں آئے گا۔ باقی سب اسی کی تشریح ہے۔ میرا یقین محکم ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ جب بھی ممکن ہوگی تو محض قیام الصلوٰۃ والزکوٰۃ سے ہی ہوگی۔

مساجد بھی ہیں موجود، اذاں بھی باقی ہے
اہتمام صلاۃ بھی ہے، مسلمان بھی باقی ہے
نہیں باقی تو فقط، فلاح نہیں اور تنظیم نہیں

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (36:17)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	زیر طبع		سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصٰفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالرزاق، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآنی اقدار اور انسانی نفسیات

(کنونشن کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

جناب صاحبِ صدر اور میرے عزیز ساتھیو سلام و رحمت!

قرآنِ کریم خالقِ کائنات کا انسانیت کے لئے عظیم تحفہ ہے اس میں دی گئی مستقل اقدار انسانیت کو کسی جنگل کے قانون کی بجائے احترامِ آدمیت پر مبنی نظامِ حیات فراہم کرتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی وہ مستقل اقدار کیا ہیں اور کیسے ایک انسان دوست معاشرے کی بنیاد بنتی ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں خود اللہ تعالیٰ کا وہ تصور سمجھنا ہوگا جو کہ قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے۔

جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔(47:12)

یعنی مادی تصورِ حیات جو کہ زندگی کی بلند حقیقتوں سے انکار پر مبنی ہے۔ جس میں خدا سے انکار اور قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار شامل ہیں۔

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی کبھی غور کیا جس نے اپنے جذبات کو ہی معبود بنالیا۔ تو ایسے شخص کی نگرانی کیسے کر سکتے ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر عقل سے کام لیتے ہیں (بالکل نہیں) یہ حیوان ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ (44-25:43)۔

جب ہم قرآنِ کریم کے اس تصورِ خدا پر اپنی Conviction سے ایمان لاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے جسم سے آگے اپنی ذات یعنی Our Non Physical Self پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے جس پر کہ قرآن کریم کا وہ تصور آخرت Ultimately لاگو ہوتا ہے اور جس ذات نے اس زندگی کے بعد بھی اگلے مراحل میں داخل ہونا ہے۔

انسانی ذات کو ماننے کے بعد ہمیں اس کی ڈویلپمنٹ کے لیے کوئی خارجی معیار بھی چاہیے جو کہ ایک Standard Reference بن سکے۔ ہماری ذات کی ترقی کو جانچنے کے لیے اور یہاں سے بات پھر ان صفاتِ خداوندی پر جا پہنچتی ہے جنہیں ہم اسماء الحسنیٰ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو اپنی ذات کی ڈویلپمنٹ کے لیے بطور معیار اپنے سامنے رکھ لینا اور اپنی ذات میں بحد بشریت ان کی نمو کو اپنی زندگی کا مقصد بنالینا ہی اللہ پر ایمان کہلاتا ہے۔

انسانی جسم کی نشوونما کا اصول اپنے لیے لینے میں ہے جو کہ ایک حیوانی جذبہ ہے اور self-preservation پر مبنی ہے مگر قرآن کریم انسانی ذات کی ترقی کا جو اصول بتاتا ہے اس کی بنیاد دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے پر ہے۔

جو اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے انہیں خود تنگی میں ہی کیوں نہ گزارا کرنا پڑے اور حقیقت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینے سے بچ جاتا ہے تو انہیں لوگوں کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔(59:9)

یعنی جو شخص شُحِ نفس سے بچ جائے وہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ قرآنی نظامِ حیات کو سمجھنے کے لیے دو اصول یاد رکھیے۔

پہلا اصول تمام بنی آدم ایک جیسے قابل احترام ہیں اور
دوسرا اصول دنیا میں بقاء اسی عمل کے لیے ہے جو نوع انسانی کے لیے نفع بخش ہو۔

ایک مومن کے مقصدِ حیات کو سمجھنے کے بعد اب ہم آتے ہیں اصل موضوع کی طرف جو کہ یقیناً آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ہیومن سائیکالوجی میں انسان کی شخصیت کو سمجھنے کا ایک ماڈل Big Five کے نام سے مشہور ہے۔ اتفاق سے یہ میری نظر سے گزرا تو مجھے اس ماڈل میں بہت سے پہلو نظر آئے جن کے متعلق قرآن کریم نے نہایت واضح راہنمائی کے لیے اقدار فراہم کر رکھی ہیں۔

Big Five Personality Model کی بنیاد اس سوال پر ہے کہ ایک ہی طرح کے Challenges میں مختلف افراد کا ردعمل کیوں مختلف ہوتا ہے۔ عہدِ حاضر کی سائیکالوجی میں جو Big Five Factors انسانی شخصیتوں کے اختلاف کا دائرہ کار بنتے ہیں وہ یہ ہیں:

Trait Dimension	Endpoints of the Dimension		
Conscientiousness	Organized	⟷	Disorganized
	Careful	⟷	Careless
	Disciplined	⟷	Impulsive
Agreeableness	Soft-hearted	⟷	Ruthless
	Trusting	⟷	Suspicious
	Helpful	⟷	Uncooperative
Neuroticism (emotional stability vs. instability)	Calm	⟷	Anxious
	Secure	⟷	Insecure
	Self-satisfied	⟷	Self-pitying
Openness	Imaginative	⟷	Practical
	Preference for variety	⟷	Preference for routine
	Independent	⟷	Conforming
Extraversion	Sociable	⟷	Retiring
	Fun-loving	⟷	Sober
	Affectionate	⟷	Reserved

Openness to experience, Conscientiousness, Extraversion, Agreeableness, Neuroticism

ایک ہی طرح کے حالات و واقعات میں مختلف لوگ مختلف ردعمل کیوں دیتے ہیں؟ عہد حاضر کی نفسیات/سائیکالوجی میں بڑے پانچ اسباب Big Five Factors ہیں:

Openness to the experience:
Imaginative, creative, original, Curious,
Conscientiousness: Hard working, well Organised, Punctual, careful, or otherwise Neglect, Lazy, Late, disorganised.
Extraversion: Talkative, Active, Affectionate, or otherwise Lone, Quiet, Possessive,

Reserved.
Agreeableness: Trusting, Lenient, Soft
Hearted, Cool Natured, Suspicious, Critical, Ruthless, irritable or otherwise.

اب اگر غور کریں تو شخصیت کی یہ ساری جہتیں کسی نہ کسی طرح Survival instincts ہیں اور انسانی شخصیت کی تکمیل یہ بالکل اس طرح کرتی ہیں جیسے کہ کسی ریاست کی تکمیل اس کے ادارے مل کر کرتے ہیں۔ مثلاً Conscientiousness کو آپ خدمات کے شعبوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جیسے کہ صحت، مواصلات، بلڈنگز اینڈ ورکس زراعت وغیرہ Agreeableness کو آپ اطلاعات اور بین الاقوامی یا خارجہ امور قرار دے سکتے ہیں Extraversion Factors کو آپ خارجہ امور قرار دے سکتے ہیں۔

Openness to the experience کو ہم

Science and Technology, Social welfare, Human Rights, strategic initiatives

وغیر سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

Neuroticism کو آپ دفاع کے شعبے سے مثال دے سکتے ہیں۔ اب آپ غور کریں ان میں سے کوئی بھی شعبہ جب Over Perform کر رہا ہو یا پھر Under Perform کر رہا ہو تو پھر Chaos کا ظاہر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ قرآن کریم کی مستقل اقدار یہ کمال کرتی ہیں کہ وہ ان فیکٹرز میں کسی قسم کے عدم توازن کو افراد کے قلوب کی تبدیلی کے ذریعے اندرونی طور پر بھی روکتی ہیں اور جماعتِ مومنین میں ان مستقل اقدار کے Reflection کی وجہ سے بیرونی طور پر بھی ان کے ظاہر ہونے کے لیے درکار Triggers کو Block کر کے انسانی شخصیت کو متوازن کرتی ہیں اور پھر ان افراد کے حسن کردار کی خوبصورتی یہ ہوتی ہے کہ بقول میر درد ؎

بسا ہے کون ترے دل میں گُل بدن اے دردؔ کہ بو گلاب کی آئی تیرے پسینے سے

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان پانچ نفسیاتی جہتوں میں قرآن کریم کی مستقل اقدار کیسے مومن کی راہنمائی کرتی ہیں۔

:Conscientiousness

قرآن پاک مومن کی شخصیت کی اس جہت میں کیسے شخصیت سازی کرتا ہے وہ اس طرح کہ:

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا نہیں اٹھائے گا (53:38)۔

جو اچھا کام کرے گا اس کو اسی کا پھل ملے گا۔ جو بُرا کرے گا اُس کا نقصان بھی اُسی کو ہوگا (2:286)۔

تمہیں اپنے کاموں کا ہی بدلہ ملتا ہے (45:28)۔

انسان اسی چیز کو ہی بطور اپنے حق کے لے سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے (53:39)۔

وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اپنے مال اور جان سے جدوجہد کرتے ہیں (9:85)

خدا کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کے مطابق رزق تلاش کرو (29:17)
اور اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو پاک اور صاف رہتے ہیں (9:108)
انسانی شخصیت کی دوسری جہت ہے۔

Agreeableness:

یعنی صلح جوئی، تعاون باہمی، گھل مل جانے کی صلاحیت، لوگوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے والا، ہمدرد پر خلوص دیکھئے قرآن کریم اس باب میں کیا فرماتا ہے:

ہم نے تمام بنی آدم کو ایک جیسا قابلِ احترام بنایا (17:70)۔
اپنی کمائی کو خدا کے بنائے ہوئے نظام کی خاطر کھلا رکھو (2:195)۔
وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں (42:38)۔
ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ (2:188)۔
ہم تم سے اس کا بدلہ تو ایک طرف شکریہ کے بھی طلبگار نہیں ہیں (76:9)۔
لوگوں سے ترش روئی مت برتو (31:18)۔
جب بھی بات کرو عدل وانصاف کی کرو (6:152)۔
لوگوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو (31:18)
جب کوئی لغو بات سنیں تو اس سے دور ہٹ جائیں (28:55)۔
جب تم گھر جاؤ تو اپنے اہلِ خانہ کو اللہ کی طرف سے دعائے خیر کہا کرو۔ وہ دعا جو تمام برکتوں اور خوشگواریوں کی حامل ہو (24:61)۔

جو (حسنِ سلوک) احسان کرتا ہو، والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں کے ساتھ ان کے ساتھ جو کام کاج کرنے کے قابل نہ رہیں۔ ہمسائے کے ساتھ خواہ وہ رشتہ دار ہو یا غیر ہو۔ دوست اور رفیق کے ساتھ مسافروں کے ساتھ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ (4:36)۔

انسانی شخصیت کی ایک اور جہت جو کہ اس کی Outlook Define کرتی ہے وہ ہے Extraversion جس کا متضاد Introvert ہے۔ اس جہت سے مراد مرکز نگاہ رہنے کی خواہش، لوگوں کے درمیان رہنے کی خواہش، گفتار کا غازی ہونا، باتونی ہونا، جوشیلا ہونا وغیرہ وغیرہ اکثر ان صفات کے حامل افراد اچھے Listener نہیں ہوتے اور اگر یہ جہت بالکل کم ہے تو وہ فرد Introvert اور ایک طرح سے بالکل Reserve سی شخصیت ہوگی۔

قرآن پاک اس جہت کو متوازن کیسے کرنا چاہتا ہے:

ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جنہیں خود کر کے نہیں دکھاتے (61:2)۔
کیا تم دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو (2:44)۔

اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو زیب و زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں انہیں کون حرام قرار دے سکتا ہے(7:32)۔
ہم نے تمہارے لیے لباس بنایا ہے جو تمہاری ستر پوشی کرتا ہے اور زینت و آرائش کا موجب بھی ہے(32:7)۔
خدا نے ہر شے کو بہترین حسن و تناسب سے پیدا کیا ہے۔ انسانی شخصیت کی ایک جہت Neuroticism یا پھر عرف عام میں Neurosis یا کہہ لیں کہ Level of Neurosis ہے۔ اس جہت کی بڑی خصوصیات میں موڈی طبیعت، چھڑ جانے والا دباؤ نہ جھل سکنے والا، مضطرب، ڈرپوک، حسد، شرمندگی، تنہائی پسند Shyness، جھجک، unthankful, Anxious, insecure, self pity or otherwise Stable, Calm, Happy
قرآن کریم ہمیں ان ذہنی امراض سے بچنے کے لیے کون سی محکم نظریاتی اساس فراہم کرتا ہے سنیئے اور جھوم جایئے۔
بدظنی سے بچا کرو(49:12)۔
دوسروں کی ٹوہ میں مت پھرو(49:12)۔
ایک دوسرے کے خلاف یونہی عیب نہ لگاؤ دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو(49:12)۔
خدا اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بُرائی کی تشہیر کی جائے بجز اس کے کہ کسی پر ظلم ہوا ہو(5:8)۔
دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو ہمیشہ عدل کرو یہی چیز قانونِ خداوند کے مطابق ہے(5:8)۔
جس بات کا تمہیں یقینی طور پر علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے سمجھ سوچ کر اس کی تحقیق کر لی تھی اور خود تمہارے اپنے دل نے تو اس کے اندر کچھ نہیں ملا دیا تھا(17:36)۔
انسانی شخصیت کی پانچویں جہت جو کہ اکثر نایاب ہوتی ہے اور منفرد لوگوں میں بکثرت ملتی ہے وہ ہے Open ness to experience اس جہت کی آگے چھے پرتیں ہیں:
تخیل Active Imagination (Fautory)
ذوق Aesthetic Sensitinty
Alertness to the Inner feelings
تنوع پسندی Preference of Variety and Diversity
تجسس Intellectual Curiosity
نئے تجربات کے لئے اور نئے آئیڈیاز کے لیے گنجائش رکھنا مستقبل بینی، ہر جدت کو Appreciate کرنے والا ترقی پسند اور تخلیقی ذہن اور Genuine Thinking Mind آپ دیکھیے قرآنِ کریم انسانی شخصیت کی اس خوبصورت ترین جہت کو کیسے نکھارنا چاہتا ہے۔ نظامِ زندگی میں/ اللہ کے دین میں کوئی زبردستی نہیں اس لیے کہ گمراہی اور ہدایت سب واضح ہو چکی ہیں۔
زمین میں جو کچھ حلال اور خوشگوار ہے اسے کھاؤ(2:168)۔
اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمت بنایا جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے(2:143)۔

تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا (3:110)۔

اگر کوئی مشرک تمہارے پاس آ کر پناہ لے تو اسے پناہ دو اور قرآن کریم کا انسانیت کے لئے پیغام سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں جانا چاہے تو اپنی حفاظت میں اس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔ (9:6)

اور اگر اللہ ایک جماعت کے ذریعے دوسری جماعت کی روک تھام نہ کرتا رہے تو راہبوں کی خانقاہوں، عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے اور دیگر مذاہب کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دیئے جائیں (22:40)۔

اب جب کہ ہم نے انسانی شخصیت کے ان سب شیڈز میں ایک انسان کی ساری Limitations کو سمجھ لیا اور اس کے فطری ردعمل کا بھی اندازہ کر لیا جو وہ مختلف حالات کے نتیجے میں دے گا تو پھر ہمیں اپنی توقعات کو بھی احساس ذمہ داری کے تابع کرنا ہوگا اور یہ سمجھنا ہوگا کہ جو نظر آ رہا ہے وہ شائد اصل نہیں ہے اور حقیقت کوئی اور ہے۔ یعنی Seeing is Believing والے نظریے سے نکل کر انسانی نفسیاتی Limitations کا ادراک کر کے قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں محبت، اپنائیت اور احساسِ ذمہ داری سے اگلے بندے کے ڈر، خوف، احساسِ کمتری اور ڈپریشن وغیرہ کو دور کر کے کامیابی سے خوبصورت تعلقات کا بیج بونا ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ جب کسی کام یا شعبے کے لیے افراد کا چناؤ ہو تو ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر ان کے لیے موزوں شعبے اور کام طے کیے جائیں تا کہ پھر ان کی محنتوں کے بھرپور نتائج آئیں ورنہ اگر مثال کے طور پر غصیلی طبیعت کے شخص کو تعلقات عامہ یا پھر ڈرا اور احساسِ کمتری والی شخصیت کو پولیس یا فوج میں لے جائیں گے تو نتائج آپ خود ہی تصور کر سکتے ہیں۔

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

سانحہ ارتحال

بزم کراچی کے بانی رکن اور تحریکِ طلوع اسلام کے نہایت سینئر ساتھی جناب محترم محمد رشید بٹ صاحب طویل علالت کے بعد 8 نومبر 2017ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم تحریک کے بہت فعال رکن تھے اور وہ ایک وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے۔ ان کی رحلت تحریکِ طلوع اسلام کے لئے بڑا نقصان ہے اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ادارہ ان کے خاندان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام

(ورکشاپ اور خصوصی لیکچرز)

منعقدہ مورخہ 21 اکتوبر 2017ء





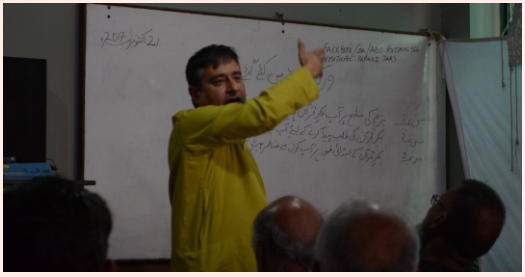




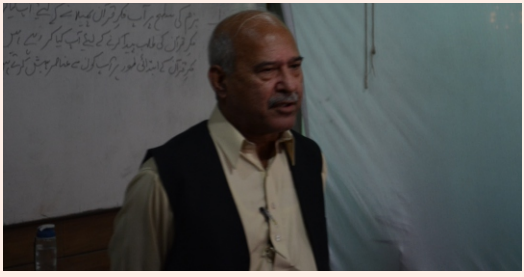

ورکشاپ: فکرِ قرآنی کو آپ کس طرح عام کر سکتے ہیں؟ از عاطف طفیل



پروفیسر رحیم الحق ایف۔سی کالج یونیورسٹی



محترم عاطف طفیل صاحب ورکشاپ کے دوران



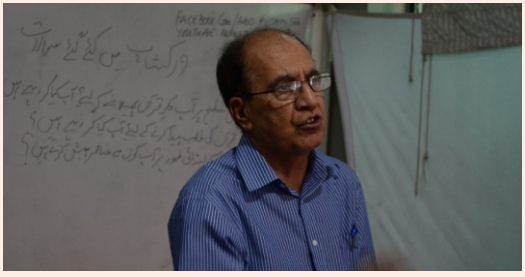
عابد حسین (بزم طلوع اسلام راولپنڈی)



روبینہ خواجہ، یوکے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



ڈاکٹر اعجاز رسول (گلاسگو)

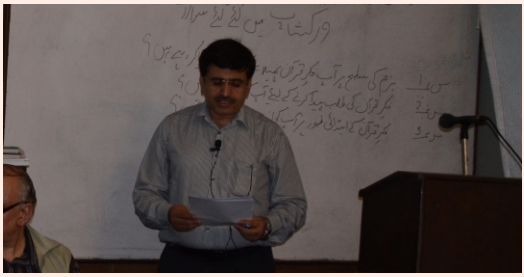


روبینہ عزیز، یوکے



سامعینِ کرام

شام 21 اکتوبر 2017ء



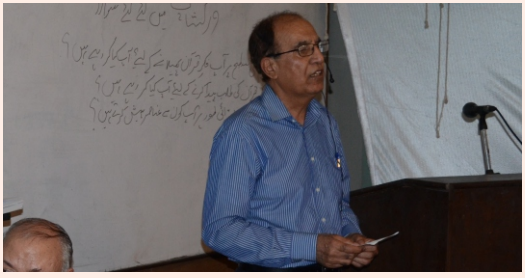
حسین قیصرانی منیجر طلوع اسلام ٹرسٹ



محمد عمر، بزم لاہور



سامعینِ کرام



خصوصی خطاب از ڈاکٹر اعجاز رسول (گلاسگو)



خصوصی لیکچر از یاسر صدیقی



سامعینِ کرام



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



ڈاکٹر حامد اے میاں وائس چیئرمین ادارہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

سماعت گاہ کے مناظر



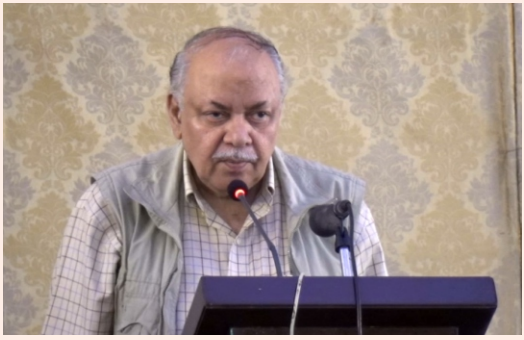




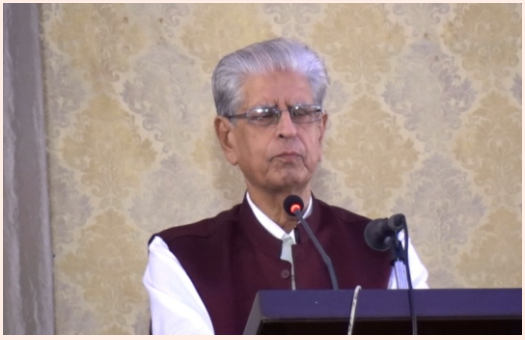



سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام
(سیمینار)

منعقدہ مورخہ 22 اکتوبر 2017ء



محمد عمر نظامت کے فرائض ادا کرتے ہوئے



محمد اکرم راٹھور اقبال کی نظم پڑھتے اور خطبۂ افتتاحیہ دیتے ہوئے



خورشید انور وائس چیئرمین ادارہ اظہار خیال کرتے ہوئے



ڈاکٹر عبدالرزاق اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



محمد شکیل مغل اظہارِ خیال کے دوران



نوشیر تقریر کے دوران



ظفر اقبال اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



سماعت گاہ کا ایک منظر





اسٹیج پر موجود مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر حامد اے میاں، خورشید انور، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر خالد سندھو، ڈاکٹر طاہرہ اکرم، اکرم راٹھور



افتخار احمد نمائندہ بزم لندن تقریر کے دوران



سامعینِ کرام



ڈاکٹر طاہرہ اکرم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



ملک محمد صفدر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے



بشیر عابد بات چیت کرتے ہوئے



عافیہ فاروقی تقریر کرتے ہوئے



خالد فاروقی اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



عقیل حیدر ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' پیش کرتے ہوئے



پروفیسر ڈاکٹر صالحہ غنی ایک مضمون پڑھتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



ڈاکٹر فریدالدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



ڈاکٹر اعجاز رسول تقریر کرتے ہوئے



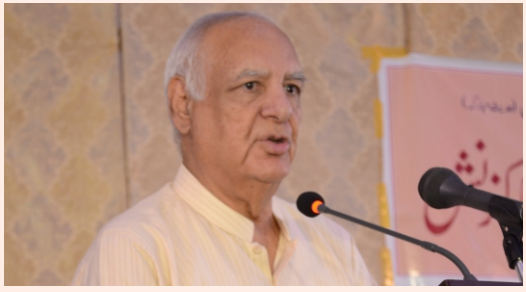
ڈاکٹر حامد اے میاں وائس چیئرمین ادارہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



ڈاکٹر زاہدہ درانی ایگزیکٹو ہیڈ ٹرسٹ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



صدرِ مجلس، ڈاکٹر انعام الحق صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے

خالد بشیر فاروقی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ

(کنونشن کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ)

صاحبِ صدر و چیئرمین ادارہ، ہمارے بھائیو اور بہنو۔

میری آج کی تحریر میری ہی لکھی ہوئی ہے مگر ہر سبق میں نے ان اساتذہ سے لیا ہے جن میں چند یہاں تشریف فرما ہیں مثلاً ایک بڑا نام شیخ اللہ دتا، فرید الدین، انعام الحق، حامد میاں، اعجاز رسول، محمد سلیم اختر، صدیق اکبر، یاسر صدیقی جو یہاں نہیں ہیں میرے والد بشیر اور ایک ایسا نام جن کے یہ سب اساتذہ، شاگرد ہیں قابلِ صد احترام غلام احمد پرویز۔

انسانی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پہلے کائنات کی تاریخ دیکھیں تو بگ بینگ سے لے کر آج تک یہ چھ ادوار کا سلسلہ ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں ستہ ایام سے کیا گیا ہے۔ چونکہ مجھے انسانوں کے متعلق بات کرنی ہے اس لئے ہم چھٹے دور کو ہی دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے کارناموں میں سے بہترین تخلیق یعنی Best Creation حضرتِ انسان ہے۔ اب اگر ہم انسانی تاریخ کو دیکھیں تو خسارہ منافع، ترقی، تنزلی سب کچھ ملے گا۔ مگر ماپا جائے تو نظر آتا ہے کہ معاملات، حالات، انسان یا یہ کائنات درست سمت جا رہی ہے۔

اس دنیا کے ممالک میں کچھ درست اور کچھ غلط راستے پر یعنی ملا جلا معاملہ ہے ___ غلط راستے پر جانے والے حضرات درست راستے پر کیوں نہیں جاتے۔ حالانکہ آنکھیں دماغ، اختیار و ارادہ رکھتے ہیں مگر پھر بھی ___ درست راستے پر جانے کے لئے آج میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں یہ فارمولا میں نے قرآن پاک سے لیا ہے۔ حوالہ ہے:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ اور اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ یعنی انسانی زندگی میں اللہ کا رول اور رسول ﷺ کا رول ___ اس کی وضاحت میں آپ کو ایک مثال سے دوں گا۔

انسانی معاشرے میں جب کوئی انتہائی منفعت بخش منصوبہ بنانا ہو تو باہمی مشاورت سے اس کی Feasibility بنائی جاتی ہے۔ میں انجینئرنگ کے شعبہ سے منسلک ہوں اور میں جانتا ہوں کہ پانی اور انرجی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً تربیلا ڈیم کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ جب پوری طرح غور و خوض کر کے منظور ہو گیا تو سمجھ آیا کہ اس کے دو حصے ہیں ایک حصہ پلاننگ اور دوسرا تعمیر کا۔ پلاننگ کے حصے میں سب سے پہلے زمین کی تلاش اور اس کی مضبوطی دیکھی گئی تاکہ لاکھوں کیوسک پانی اس میں جمع کیا جا سکے۔ پانی جمع کرنے کے لیے اگر دو قدرتی پہاڑ مل جائیں تو ایک طرف Concrete کا مضبوط پہاڑ بنایا جاتا ہے۔ جس میں دریا کا سارا پانی روک لینا ہوتا ہے۔ پانی کی مدد سے نہ صرف بجلی پیدا

کی جاسکتی ہے بلکہ فصلوں کو بھی سیراب کیا جاتا ہے اور اس سے تین چار نسلیں مستفید ہوتی ہیں۔ پہلے فیز میں نقشے اور رپورٹس بنتی ہیں یہ ایک ٹیم ورک ہوتا ہے اور پچاس، ساٹھ Engineers کا گروپ چند سال کی تگ ودو کے بعد مکمل مربوط document بنا کر دستخط کر دیتے ہیں۔ یہاں تک ایک غیر متبدل تحریر شدہ منصوبہ تیار ہوتا ہے۔ یہ منصوبے کا پہلا فیز ہے۔

دوسرے فیز میں اس کی تعمیر یعنی Execute کرنا ہے اس کے لیے ایک انٹرنیشنل ٹینڈر Float کیا جاتا ہے۔ تاکہ بہترین اور تجربہ کار ٹھیکیدار رجوع کریں اور اس کی تعمیر کا فیصلہ کیا جاسکے۔ جتنا اہم پلاننگ کا مرحلہ ہے، اتنا ہی ضروری اور قابلِ توجہ تعمیر کا مرحلہ ہے۔ تعمیر کرنے والا ہر حالت میں پابند ہوتا ہے کہ وہ نقشوں اور ہدایت کے مطابق ڈیم تعمیر کرے۔ نا کہ خود کوئی ہدایت نامہ مرتب کرنا شروع کر دے۔ اس کا کام صرف اور صرف اس Document کو Follow کرنا ہوتا ہے۔

میں بلا تمثیل اس وضاحت سے آپ کی توجہ قرآن کریم کی آیت نمبر (4:59) کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جہاں کہا گیا کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۔۔۔۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی ۔۔۔۔)

تعمیرِ ذات اور تشکیلِ انسانی معاشرہ کا پلان اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرتب فرمایا اور پوری وضاحت وراہنمائی کے ساتھ، نبیٔ اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی عطا کیا کہ ان ہدایات کے مطابق اسے عملی طور پر تشکیل وتعمیر کریں۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ (9:33، 48:28، 61:9)

اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدات اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے۔

وحی خداوندی آنے والی نسلوں کے لیے ایک مکمل اور غیر متبدل راہنمائی ہے۔ تعمیرِ ذات اور تشکیلِ معاشرہ کا غیر متبدل، مکمل اور کفایت کرتا ہوا ایک جامع پلان ہے۔ اس کے نفاذ اور غلبہ کا پروگرام نبی کریمؐ کے سپرد ہوا جنہوں نے بکمال احتیاط اسے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر تعمیر اور قائم کیا۔ ہدایات کے عین مطابق اسے Execute کیا۔ نقشہ اور ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی تھی۔ آپؐ نے اس کی تشکیل وتعمیر میں کردار ادا کیا پوری راہنمائی دی اور اسے حسب فرمانِ خداوندی قائم فرمایا۔ قابلِ توجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے جاتے وقت خود کوئی ہدایت نامہ مرتب کر کے نہیں دیا، صرف Execution طریقِ عمل میں ایک نمونہ پیش فرمایا جسے اسوۂ رسول کہتے ہیں۔ اصلی پلان مکمل اور غیر متبدل حیثیت میں امت کے حوالے کر گئے تا آئندہ آنے والی نسلیں اسے تشکیل وقائم رکھیں۔ ہدایت یعنی نقشہ اللہ کا تھا اور تعمیر آپ نے فرمائی اس طرح یہ ہمارے لئے اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی بہترین شکل ہے۔

آخر میں علامہ اقبالؒ کے دو اشعار:

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی — مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تُو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا — کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

(ستارے کا پیغام، بالِ جبریل)

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ سے پیوستہ

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

سوشل جسٹس:

یہ تھا عدل، یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی' سوشلزم کی طرح' ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔Due) کا تعین' پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principales) کے مطابق ملے۔لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں' یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے' اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔وہ کہتا ہے کہ:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے' وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین' معاہدات' رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق' الوہیاتی معیار موجود ہے' ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔
>
> (Justice and The Social Order)

رزق کا حق:

قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ' از روئے قوانین خداوندی حقدار ہے' عدل کہلائے گا اور یہ قوانین' قرآن کے اندر موجود ہیں۔لہٰذا' قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے' ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ان ابدی اور غیر مشروط حقوق

میں قرآن نے سب سے پہلے ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

(مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (11:6)

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

(مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ (6:152)

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے۔ یعنی تمام افراد معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا، اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے اور قرآن کی رو سے، زمین پر۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ (41:10) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد، جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بال آخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ: لنا رقاب الارض۔ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربوٰ کا مفہوم:

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد، سب سے اہم سوال، حصول دولت کا ہے۔ عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہئے یا سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث

ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر ونظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر ہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے' ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس' ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا (2:278) ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ (2:279) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا اجرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔ (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا' ربوٰ کا مرتکب' اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا' قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے' حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا' سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (53:39) یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی' جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے' کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219) ''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے' سب کا سب۔'' اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

> رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم:

کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs. یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں' سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مال غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ ﷺ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادہ شدہ کو دگنا حصہ' کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افراد معاشرہ کو رزق۔۔ یعنی سامان زیست۔۔ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا' جس میں کیفیت یہ ہو کہ: اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (20:118-119) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامان آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ (22:23) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات ثِيَابُ خُضْرٌ مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (18:31) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ مرصع اور نرم و نازک صوفے فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿۱۵﴾ (76:15) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ: نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾ (76:20) عظیم مملکت اور اس میں سامان آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامان آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فرد معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیار زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب و زمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراط زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی' تو ظاہر ہے کہ اس میں' ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔ حسد' کینہ' انتقام' تنگ نظری' حرص' ہوس' فریب کاریاں' مکاریاں' سازشیں۔۔ اور دوسری طرف بے حمیتی' بے غیرتی' ذلت نفس' تملق' خوشامد' منافقت وغیرہ' یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان' وجہ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے' نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

(56:25-26) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز و آہنگ جاں افروز سناتی دیتی ہے۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ (7:43) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان' غلط معاشرہ میں' دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا اندازہ وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؔ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چونوش	خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب	راز دانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست	ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر	کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است	از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو!	حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں	نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ	از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش!	نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبالؔ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست	عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ (21:92) اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت' حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء' خود اربابِ نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول' قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور ﷺ نبی اکرم کا یہ ارشاد گرامی کہ:

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن و خوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولائیت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی، جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جوان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔ عبداللہ۔۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے، کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بد دیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بد دیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بد دیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہی۔ یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد، زر اندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں، تمام افراد مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی، کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس نظام میں کوئی شخص بد دیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بد دیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے:

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی

وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسمیں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور، ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد، اس کے زور بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؔ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں، کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے، محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔ (23:51)

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا، تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا، وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) وہ جہاں سے جی چاہتا، پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ: فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ (20:117) وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا، جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ (7:24) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد:

قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ

كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (7:157) یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا' جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی' اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل' وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں' ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر' یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے' انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار' شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو' اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ ''چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار' اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن:

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾ (10:62) ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور

حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ کس قدر قابل حمد وستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ (35-35:34) وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔ فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱﴾ (1:1) سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے والا۔۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی بنیادی

ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوار حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے، تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (76:9) ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا، ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا، نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ: یقسم المال صحیحاً وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ: بالسویۃ بین الناس تسویہ کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ استوی الرجل کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت وامامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔ لیکن اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر 175 سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا (7:175)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولنا کیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ' تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ (7:176) یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ (7:176) تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ' شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔ سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (7:177) اف! کس قدر بری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ: وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ (7:177) وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں' خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ (7:179) وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (7:179) ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179)۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (7:179)۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (7:179) حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا' اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہوذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم مذہب کے خلاف ایک احتجاج ہے

مشہور اخبار ''ڈیلی ڈان'' کی اشاعت بابت 14 اکتوبر 2017ء میں جناب ڈاکٹر ہود بھائی صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''Is IS actually bad? Unislamic?'' طبع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے ایک مشہور سکالر اور دنیا کے معروف سائنسدان ہیں چونکہ ہمیں بھی عرصۂ دراز سے ڈاکٹر صاحب سے نیاز مندی حاصل ہے اس لئے ہم بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک شریف الطبع انسان ہونے کے علاوہ، ایک محب وطن پاکستانی بھی ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے نکات تو بہت اٹھائے ہیں، جن کا ہمارے ساتھ براہِ راست کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ ان کے نکات میں سے ایک نکتہ جس کا ہمارے ساتھ براہِ راست تعلق ہے یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم سٹیٹ کا کوئی تصور پیش نہیں کرتا اور اپنے اس موقف کی تائید میں انہوں نے ابن خلدون اور الماوردی کو بطور سند پیش کیا ہے، اس زیر نظر مضمون میں ہم صرف اس نظریہ کی تردید تک اپنے کو محدود رکھیں گے اور قرآن کی آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن کریم ایک مذہب نہیں ہے، اس کا مذہب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ سارے قرآن میں مذہب کا لفظ تک نہیں آیا، یہ ایک دین ہے۔ ایک ضابطۂ حیات ہے اور وہ دین ہے جو اللہ کے ہاں مقبول ہے اور صرف یہی دین اسلام اللہ کے ہاں مقبول ہے باقی کوئی دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے (3:85) ہم ڈاکٹر صاحب کے احترام کی وجہ سے اس مضمون پر کوئی تبصرہ نہ کرتے لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون پاکستان کے دانشوروں کی سوچ کی نمائندگی و ترجمانی کرتا ہے اور پاکستان کے اکثر دانشور قرآن کو ایک مذہبی کتاب گردانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کارل مارکس کے نظریات کے ردعمل میں علامہ اقبال نے بھی اسلامی سٹیٹ کا تصور پیش کر دیا تھا اور ان کے الٰہ آباد کے ایک خطبہ کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ فکر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ دانشوروں کی اس غلط فہمی کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے باقی اسلامی سٹیٹ کی جو برکات اور اس کے جو ثمرات انسانیت کو حاصل ہوتے ہیں، ان کو تحریر کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہوگی۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب نے ابن خلدون اور الماوردی کے حوالے سے سٹیٹ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی اسی لفظ کو دہرا دیا ہے۔ اردو زبان میں سٹیٹ کا ترجمہ حکومت ہوتا ہے۔ ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن نے حکومت کا جو تصور پیش کیا ہے، اردو زبان کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ہم اس کے لیے حکومت کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ورنہ اصل

یہ ہے کہ قرآن کے پیش کردہ تصور کے لیے حکومت کا لفظ درست نہیں ہے۔ حکومت میں حاکم ومحکوم ہوتے ہیں اور حاکم حکومت کرتے ہیں جبکہ قرآن کی رو سے انسانوں کی، دوسرے انسانوں پر حکومت حرام ہے (3:79، 12:40، 12:67) قرآن کریم انسانوں کو قانون سازی کا حق ہی عطا نہیں کرتا۔

کس در این جا سائل ومحروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

قرآن کریم جو تصور پیش کرتا ہے اس کو بیان کرنے کے لیے اسلامی ہیئت اجتماعیہ کے الفاظ قرآنی تصور سے قریب تر ہیں یا اس کو مختصر الفاظ میں اسلامی نظام کہہ سکتے ہیں۔ اُمت مسلمہ کو جب اقتدار ملتا ہے تو پوری کی پوری اُمت برسر اقتدار آتی ہے (24:55)، اس اسلامی نظام میں نظام کا نصب العین اور افراد کا نصب العین ایک ہوجاتا ہے۔ اس لئے انسان اور انسان، انسان اور کائنات، اور خود انسان کے ذاتی تضادات میں توافق پیدا ہوجاتا ہے۔ ملت اور نظام ایک ہوجاتے ہیں ملت ایک مشینری مقرر کردیتی ہے جو معاشرہ میں نظم ونسق قائم رکھتی ہے، اور خود اس کا جزو ہوتی ہے۔

ہم اپنے مضامین میں آیات کے کثرت سے حوالے دیتے ہیں ہم دائیں طرف سورت کا حوالہ، اور بائیں طرف آیت کا حوالہ دیتے ہیں مثلاً (6:20) سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت چھٹی سورۃ الانعام کی بیسوی آیت ہے۔ قرآن کے مختلف نسخوں میں بعض مرتبہ، ایک یا دو آیت کا فرق ہوجاتا ہے۔ احتیاطاً متصل آیات پر بھی نگاہ ڈال لیا کیجئے۔

اصل مضمون شروع کرنے سے پیشتر دو باتیں بطور تمہید عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ قابل توجہ ہے کہ حکومتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک حکومت وہ ہوتی ہے جو طاقت کے زور پر حاصل کی جاتی ہے۔ اس کو سلطنت یا ملوکیت کہتے ہیں۔ دوسری طرح کی مملکت وہ اسلامی نظام ہوتا ہے جو ایمان اور اعمال صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد عالی ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) ترجمہ: وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے، اللہ اُنہیں حاکم کردے گا زمیں پر۔ قرآن کریم نے ایمان واعمال صالح کا نتیجہ اس زمین میں اقتدار حاصل ہونا بیان کیا ہے۔ اقامت دین یا اسلامی نظام کے قیام کا واحد ذریعہ ایمان واعمال صالح ہیں۔ ایمان اور اعمال صالح کا لازمی نتیجہ غلبہ حاصل ہونا ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کو ایمان اور اعمال صالح کے باوجود غلبہ واقتدار حاصل نہیں ہے تو یا تو اس قوم کا ایمان درست نہیں ہے یا اس کے اعمال صالح نہیں یا دونوں وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اعمال صالح ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حُسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو۔ جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام درست ہوجائیں اور انسانی ذات کی صلاحیتوں میں نشوونما ہوجائے۔ ایمان اور اعمال صالح میں تشدد یا Violence کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم نے نظریات زندگی، تصورِ حیات اور اقدارِ خداوندی کو كَلِمَتُ اللّٰهِ کہا ہے اس کے لیے فرمایا: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) فرمایا خدا کا عطا کردہ نظریۂ زندگی، اس مقصد کی طرف جاتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کردیا ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) اور اعمال صالح اس

اسلامی نظام کو منزل مقصود تک لے جاتے ہیں۔ کسی مقام پر کوئی تشدد نہیں کیا جاتا۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق ارشاد عالی ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:15-16) ترجمہ: اے اہل کتاب اللہ کی طرف سے تمہارے پاس حق کی روشنی اور ایسی کتاب آئی ہے جو روشن ہے۔ خدا کی اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کے قوانین سے ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کریں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے۔ اس کتاب کا بتایا ہوا راستہ امن وسلامتی کی طرف لے جاتا ہے۔ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (6:128) ترجمہ ان لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی اور عافیت کا گھر ہے۔ وہ ان کے اعمال حسنہ کی وجہ سے ان کا رفیق ہے۔ جس طرف اللہ دعوت دیتا ہے وہ خود امن کا گوشہ ہے وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ (10:25) ترجمہ اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو چاہتا ہے اس سیدھی راہ پر لگ چاتا ہے۔

اس قرآن کے بھیجنے والے خدا کی صفت المومن ہے جس کے معنی ہے امن عالم کی ضمانت دینے والا۔ اس کی دوسری صفت السلام ہے۔ یعنی سلامتی دینے والا، خود اس (دین) اسلام کے معنی امن واسلامتی کے ہیں اور اس کے ماننے والے مومن، امن کے ذمہ دار اور مسلم کہلاتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیم امن وسلامتی کا پیام ہے۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ضروری ہے کہ عقل انسانی نے زندگی گزارنے کے لئے خود کوئی ضابطۂ حیات وضع نہیں کیا ہے۔ قبائلی سسٹم خود وجود پذیر ہوا جس شخص نے اوروں سے زیادہ قوت اکٹھی کر لی وہ بادشاہ بن گیا، اس طرح ملوکیت کا دور شروع ہوا، جمہوریت جس کا آج دور دورہ ہے، اور جس کی ہر جگہ تعریف کی جاتی ہے، وہ کوئی ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ وہ صرف حکومت چلانے کا ایک طریقہ تجویز کرتی ہے۔ بھارت میں 70 سال سے جمہوریت ہے۔ وہاں جمہوریت کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ دلیت اب بھی جانوروں کی طرح سمجھے جاتے ہیں۔ برہمنوں کو اب بھی بہت بڑا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ 70 سال میں وہاں کوئی فرق نہیں ہوا۔ اگر جمہوریت حکومت کرنے کے طریقے تجویز کرنے کے علاوہ ان کی زندگی کا ضابطۂ عمل بن جائے تو وہاں Caste System ختم ہو جائے گا جو ہندوازم کی بنیاد ہے۔ جمہوریت بطور ضابطۂ حیات ہندوازم کے خلاف ہے۔ دونوں میں سے ایک ہی رہ سکتا دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔ البتہ کمیونزم عقل انسانی کا وضع کردہ نظام تھا۔ لیکن چونکہ اس کی کوئی اساس نہیں تھی وہ ناکام ہو گیا۔ عقل انسانی کسی نظام کی بھی اساس طے نہیں کر سکتی۔ علامہ اقبال نے کمیونزم کا سب سے بڑا نقص اور اس کی خامی یہی کہی تھی کہ کمیونزم کی کوئی اساس نہیں ہے جس پر وہ قائم رہ سکے۔

ای کہ می خواہی نظامِ عالمے جستہ او را اساس محکمے

ترجمہ: تم جو ایک ضابطہ حیات کی تلاش میں ہو کیا۔ تم نے اس کی بنیاد بھی تلاش کی ہے؟

ہم اس بات کو، آپ کے غور کرنے کے لیے دوبارہ تحریر کرتے ہیں کہ کسی بھی نظام کی کوئی بنیاد عقل انسانی تلاش نہیں کرسکی۔ عقل انسانی کے وضع کردہ تمام نظام Expendiency پر چلتے ہیں۔ یہ صرف اسلامی نظام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، جس کی عمارت ایک اساس محکم پر استوار ہوتی ہے اور اساس بھی وہ ہے کہ جس کے نتائج اس دنیا میں آنکھوں کے سامنے آجائیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

زندگی (The Life) ہزاروں، لاکھوں سال میں، آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی، جمادات، نباتات کی منازل طے کرنے کے بعد حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے، ایک توانائی یعنی ایک صلاحیت اور ایک استعداد عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (15:29، 32:9) یہ توانائی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو مل جاتی ہے۔ تو قرآن کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع مجموعی طور پر ملتی ہے تو قرآن اس کو نفس کے لفظ سے پکارتا ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو جسم اور روح کے مرکب کہتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب گردانتا ہے اس نفس کو، علامہ اقبال کی زبان میں خودی کہتے ہیں اور اسی نفس کو انسان کی سائیکی، Memory اور شعور بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک شے جسم انسانی کے ساتھ ہوتی ہے، اس کا ساتھ ہونا برحق ہے۔ آپ اس کو کسی نام سے پکار لیں۔

انسانی جسم تو لاکھوں Cell سے مرکب ہوتا ہے اور ان Cells میں ہر وقت تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس کو اصطلاح میں Metabolism کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم چند سال میں بالکل بدل جاتا ہے۔ مگر یہ توانائی و استعداد اس جسم میں اسی طرح رہتی ہے۔ انسانی جسم کے ساتھ ساتھ یہ شے ہر شخص کے ساتھ ہوتی ہے اس پر ہم ایمان لاتے ہیں اگر کوئی شخص اس ذات پر ایمان نہیں لاتا تو قرآن کی رُو سے وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ انسانیت کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ صرف حیوانیت کی حد تک پہنچتا ہے۔ نہ اس کو وحی الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اقدارِ خداوندی کی۔ اصل چیز یہ ذات اور نفس ہی ہوتی ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ آپ کے بیٹے نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا ہے تو آپ کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ کی یہ خوشی آپ کے ہاتھ یا آپ کے پاؤں کو نہیں ہوتی بلکہ یہ خوشی آپ کی ذات کو ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کی تواضع نہیں کرسکے تو اس کی شرمندگی آپ کے سراپا یا نگ کو نہیں ہوتی یہ آپ کی اسی ذات کو ہوتی ہے۔

میں آپ سے محوِ گفتگو ہوں، اور اپنی گفتگو میں میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میری جان، میری روح کے الفاظ استعمال کر رہا

ہوں۔ یہ ایک شے ہے جس کی طرف میں ان چیزوں کی اضافت کر رہا ہوں۔ بعض لوگوں کی حادثات میں ٹانگیں کٹ جاتی ہیں، ان کا جسم پورا نہیں رہتا۔ لیکن یہ نفس برقرار رہتا ہے۔ آپ اس کو Psyche، شعور یا یادداشت کچھ کہہ لیں۔ اصل چیز یہ ہی ہے اور اس کو نشوونما دینا انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور یہی وہ اساس محکم ہے جس پر ریاست کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

جسم انسانی کی نشوونما طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کے طریقے عقل انسانی مقرر نہیں کر سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے نفسِ انسانی کی نشوونما کے دو طریقے بتائے ہیں۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے وہ اقدار بڑی وضاحت سے بیان کی ہیں۔ ان میں سے چند اقدار ہم تحریر کرتے ہیں۔ (1) احترامِ آدمیت، (2) عدل، (3) مدارج بہ اعتبار عمل، (4) قانون کی اطاعت، (5) احسان، (6) کوئی کسی کا محکوم نہیں۔ انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر حرام ہے (7) کسی کی ذمہ داری دوسرا شخص نہیں اٹھا سکتا، (8) مشاورتی نظامِ مملکت (9) حفاظت و عصمت، (10) نوعِ انسانی اُمتِ واحدہ ہے۔

ہم نے بات واضح کرنے کی وجہ سے یہ دس مستقل اقدار تحریر کی ہیں۔ یہ مستقل اقدار اسلامی نظام کی اساس ہوتی ہیں ان مستقل اقدار پر عمل کرنے سے جہاں نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے، ان مستقل اقدار پر عمل کرنے سے نظام بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک آدمی حرام مال اس لئے نہیں کھاتا کہ حرام مال کھانے سے اس کے نفس پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اس شخص کے مال حرام کھانے سے اجتناب کی وجہ سے اس معاشرہ میں حرام مال کھانا ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن نے فرمایا کہ دوسروں پر اپنا مال خرچ کرنے سے اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ﴿۱۸﴾ (92:18) ترجمہ: جو اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد وَمَنْ تَزَكّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰی لِنَفْسِهٖؕ (35:18) جو دوسروں کی پرورش کرتا ہے، اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں دوسروں کی پرورش کرنے سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ذات کی پرورش ہوتی ہے اور معاشرہ اصلاح پذیر ہو جاتا ہے۔ سیکولر حکومتوں میں ''ڈنڈے کے زور'' سے اطاعت کرائی جاتی ہے۔ اسلامی نظام کی اطاعت کرنے سے عبادت خداوندی ہوتی ہے، اس لئے اس کے باشندے اس نظام کی اطاعت خود بخود دل کی رغبت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس نظام میں اطاعت ہوتی ہے۔ اس میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلامی نظام میں تھانے، تحصلیں، عدالتیں یہ سب مساجد اللہ ہوتی ہیں۔ ان اداروں سے جاری کردہ احکامات کی اطاعت سے عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں جب آپ بجلی کا، پانی کا اپنے مکان کا ٹیکس ادا کرتے ہیں تو یہ عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ چونکہ اس نظام کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے، اس لئے ہر شہری دل کی رغبت کے ساتھ ریاست کے Dues ادا کرتا رہتا ہے۔

آپ اس مثال کو سامنے رکھیں کہ سیکولر نظام میں ایک شخص اپنے مکان میں تنہا بیٹھا ہے۔ وہ روزہ سے ہے سخت گرمی

ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرج میں ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی ہے لیکن وہ روزہ نہیں توڑتا، لیکن یہی شخص جب اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہے تو ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس کی اطاعت نہیں کرتا۔ اسلامی نظام میں جو شخص روزہ نہیں توڑتا، وہ ٹریفک سگنل کی بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں Sin اور Crime ایک چیز ہو جاتے ہیں۔ جو شخص Sin نہیں کرتا وہ Crime نہیں کرتا۔

دوسری چیز جس سے نفسِ انسانی کی نشوونما ہوتی ہے وہ صفاتِ خداوندی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ انسانیت کو مجموعی حیثیت سے ایک توانائی عطا کرتا ہے تو اس توانائی کے حصول کے بعد صفاتِ خداوندی کی تمام صلاحیتیں انسانوں میں بالقوہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو بالفعل عمل میں لائے۔ اللہ رب ہے، اللہ رازق ہے، اللہ عادل ہے، کریم ہے، رحیم ہے، جبار ہے، قہار ہے۔ یہ صفات خداوندی تقاضہ کرتی ہیں کہ انسانیت ان صفات پر عمل کرے اور معاشرہ میں ان صفات کا دور دورہ ہو۔ ہر طرف ان پر عمل ہوتے ہوئے دکھائی دے رہا ہو۔ چونکہ یہ صفات خداوندی اسلامی نظام کی اساس ہوتی ہیں اس لئے بھی ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ان صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے میں پیدا کرے۔ جس درجہ ان صفات کو اپنے میں پیدا کرے گا۔ اسی درجہ قربِ الٰہی اس کو حاصل ہو جائے گا۔ اللہ رب ہے تو ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کی ربوبیت کرے۔ اللہ رازق ہے، تو ہر شخص کا فرض ہے کہ دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ رزق فراہم کرے۔ اللہ کریم ہے، وہ رحیم ہے، ستار، غفار و عزیز و غفور ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ان صفات پر عمل کرے۔ جس صفت کے استعمال کا موقع ہو، اس جگہ وہ ہی صفت بروئے کار لائے۔ اگر صفت عفو کا مقام ہے تو صفت عفو پر ہی عمل کرے، اس وقت صفت عدل پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے قرآن کریم کی آیات کے بعد اللہ کی کوئی نہ کوئی صفت استعمال ہوتی ہے۔ کسی آیت کے آخر میں حکیم لکھا ہوتا ہے، کسی آیت کے بعد عزیز تحریر ہوتا ہے یہ صفات اس آیت کے مفہوم کے مطابق تحریر ہوتی ہیں، یہ بغیر سبب کے تحریر نہیں ہوتیں۔ ان صفات کا آیت کے ساتھ ربط ہوتا ہے۔ آیت کا یہ ربط بتاتا ہے کہ ہمیں کس مقام پر کون سی صفت استعمال کرنی چاہئے۔ صفاتِ خداوندی کا معاشرہ کے ساتھ براہِ راست کیا تعلق ہے یہ ایک طویل بحث ہے جو اس مضمون میں نہیں آسکتی۔ ہم نے یہاں صرف اتنا تحریر کر دیا ہے جس کا تحریر کرنا، اس مضمون کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ تو دنیا کی تخلیق کی غرض اور اس کی تخلیق کا سبب ان صفاتِ خداوندی کو ظہور میں لانا ہی ہے۔

اس دنیا کا سارا نظام ہی یہ ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبورِ محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محل و موقع نہ رہتا۔ مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، قائم بالقسط وغیرہ۔ اس عالم کو پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب، کوئی انسان، جو خدا کو فاعل مطلق، اور فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا کوئی اور غرض پیدائش عالم کی نہیں بتا سکتا۔ علامہ اقبال نے ان صفات کے متعلق ارشاد فرمایا۔

رنگ او برکن مثالِ او شوی در جہاں عکس جمال او شوی

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ (2:138) اللہ کا رنگ، اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہوسکتا ہے۔

ہم صفاتِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرہ میں ان صفات کو جاری کردیں، ہر طرف ان صفات پر عمل ہورہا ہو، تو یہ معاشرہ ایسا معلوم ہونے لگے گا جیسے اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ اس زمیں پر جلوہ افروز ہوگیا ہے۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69)

ان تمام توضیحات سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سیکولر حکومتیں مقصود بالذات ہوتی ہیں کہ وہ زندگی گزارنے کے نظم ونسق مہیا کردیتی ہیں۔ پھر ان حکومتوں میں Law & Order بہترین شکل میں جاری ہوتا ہے۔ ہر شخص کو رزق فراہم ہوتا ہے لیکن اسلامی نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ وہ اجتماعی نظم ہوتا ہے جس میں خدا کی صفات انسانی دنیا میں ایک ٹھوس شکل اختیار کرلیتی ہیں چونکہ اس نظام کی بنیاد بھی ان صلاحیتوں پر ہوتی ہے، جن کی نمود کرنا، انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اسلامی نظام کی اطاعت سے انسان کی یہ ساری مضمر صلاحیتیں نشوونما پاجاتی ہیں۔

ہم نے یہاں تک اسلامی نظام کا تھوڑا سا تعارف کرادیا ہے کہ اس نظام میں جسم کی بھی پرورش ہوتی ہے اور اس میں ذات کی بھی نشوونما ازخود ہوتی جاتی ہے۔ سیکولر حکومتوں میں نفس انسانی کی پرورش نہیں ہوسکتی۔ نفس انسانی کی پرورش صرف اسلامی نظام میں ہی ممکن ہے اور اتنی ہوجاتی ہے کہ وہ انسان کی جسمانی موت کے ساتھ مرتی نہیں۔ اقبال نے کہا ؎

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

اس نظام میں نفس انسانی اس درجہ مضبوط ہوجاتا ہے کہ وہ نہ صرف مرتا نہیں بلکہ وہ اگلی منازل طے کرتا ہوا اگلی انواع میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔ جنت بھی زندگی کا آخری مقام نہیں ہے بلکہ وہ وہاں بھی نئی نئی منازل طے کرتا رہتا ہے۔ (57:12)

اس پوری تحریر کا ڈاکٹر صاحب کے اعتراض سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا اصل اعتراض یہ ہے کہ قرآن نے حکومت کا کوئی تصور نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے اس موقف کی تائید میں ابن خلدون اور الماوردی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اب یہاں سے ہم براہِ راست ڈاکٹر صاحب کے سوال سے Deal کرتے ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پیشتر قرآن کریم نے ایک دعویٰ کیا تھا جس پر وہ آج بھی جم کر کھڑا ہے اس کا ارشاد عالی ہے وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (2:216) ترجمہ: اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم جسے ناپسند کرتے ہو اس میں تمہاری بھلائی ہو اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسے تم پسند کرتے ہو اس میں تمہاری بُرائی ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو وہ واقع میں بھی تمہارے حق میں ویسی ہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو اپنے لئے مضر سمجھو اور وہ مفید ہو

اور کسی چیز کو مفید خیال کرو وہ مضر ہو۔ تمہارے نفع اور نقصان کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ تم اُسے نہیں جان سکتے۔ اس آیت میں قرآن نے علم کی تنقیص یا تخفیف نہیں کی بلکہ کہا یہ ہے کہ جہاں ایک طرف دنیاوی نقطہ نظر سے مفاد ہی مفاد نظر آ رہے ہوں، اور دوسری طرف دنیاوی نقطہ نظر سے بظاہر نقصانات نظر آ رہے ہوں ایسے مقام پر صحیح فیصلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر عقل اپنا مفاد سوچتی ہے۔ اسے دوسرے کے فائدہ کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے اس آیت میں دعویٰ یہ کیا ہے کہ عقل انسانی Good and Evil کا تعین نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی خیر و شر کو Define ہی نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم اپنے اس دعویٰ پر آج بھی جم کے کھڑا ہے۔

عالمی شہرت کے مالک برٹرینڈ رسل سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ تنہا عقل کی مدد سے Good and Evil کے مسئلہ کو حل کر سکے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خیر و شر کے مسئلہ کا تعلق عقل سے نہیں ہے اس کا تعلق جذبات Feelings سے ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عقل اس کا حل پیش کر سکے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جذبات تو انفرادی ہوتے ہیں اس لئے خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہی ہے۔ ان کے نزدیک خیر محض کوئی شے نہیں ہے اور نہ ہی اخلاقی شعور Moral Conciousness کوئی مطلق چیز ہے۔ Ethics سب Relative ہیں۔ جو بچے کی پرورش کے ساتھ Develop ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کا معیار انفرادی یا اجتماعی عقل انسانی ہے۔ اوپر درج شدہ آیۂ کریمہ کا آخری حصہ یہ ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (2:216)، ترجمہ تم اپنے مفادات کو خود نہیں جان سکتے، اللہ تمہارے مفادات کو جانتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو قانون سازی کا حق بھی نہیں دیا۔

سورۂ مائدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ عزاسمہ ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)، الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ (5:45)، الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (5:47) ترجمہ: جو ما انزل اللہ قرآن کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ ان تین آیات کی تفسیر جو مولانا مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن میں کی ہے ہم اُسے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا۔ اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں جہاں یہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔''

اسی بارے میں مولانا مودودی مرحوم کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی، قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اس صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کئے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط (4:105) اے نبی ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس روشنی میں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دکھائی ہے۔ اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر کردہ قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (9:60) اس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا ہے اور سود خوری جاری رکھنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے (2:178)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (5:38) زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (24:42)، قاتل سے قصاص لینے کا حکم (2:178)، وہ اسی صورت میں روبہ عمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ احکام اس مفروضے پر نہیں دیئے گئے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔''

اب ہم آپ کے سامنے چند آیات پیش کرتے ہیں:

(1) اگر قرآنی نظام قائم کرنا فرض نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ نے اس درجہ مشکلات و صعوبات برداشت کر کے یہ نظام کیوں قائم کیا۔ مشرکین مکہ حضور ﷺ کو پرستش کی رسول ﷺ کو ادا کرنے سے منع نہیں کرتے تھے۔ ان کا پرستش کی رسوم کی تبدیلی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اصل جھگڑا ہی نظام کا تھا۔ حضور نے مشرکین مکہ سے 82 دفاعی لڑائیاں لڑیں۔ لیکن حضورؐ اپنے مشن سے باز نہیں آئے۔ اگر اسلامی نظام کا قائم کرنا حضورؐ پر فرض نہیں تھا تو کیا حضورؐ نے اپنے فرائض منصبی سے تجاوز کیا تھا۔ نظام کا قائم کرنا حضورؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھا (42:13)۔

(2) قرآن کے نزدیک غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:23) جب مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو مکہ کے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ فوراً مدینہ ہجرت کر جائیں اور مکہ کے مسلمانوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں جب تک وہ ہجرت کر کے مدینہ نہ آ جائیں۔

(3) قرآن کریم میں ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) ترجمہ: اللہ حکم دیتا ہے کہ تم عدل سے کام کرو۔ ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لینے کا حکم قرآن کریم میں اور دیگر مقامات پر بھی آیا ہے یہ ایک معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ عدل و انصاف سے کام لینے کا حکم دے رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ عدل و

انصاف پر مبنی قوانین بھی انسانیت کو عطا کرے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ عدل کا حکم کرے اور عدل پر مبنی قوانین نہ دے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی یہ مراد ہوسکتی ہے کہ بھارت کے قوانین کے مطابق عدل کریں یا برطانیہ کے قوانین کے مطابق عدل کرو۔ برطانیہ میں تو ہم جنس پرستی اور سود جیسے قوانین جاری ہیں جو سراسر ظلم پر مبنی ہیں۔ اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری کرو اور اس ریاست میں اللہ کے قانون کے مطابق عدل کرو۔

(4) ارشاد عالی ہے فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) ترجمہ: حضور ﷺ کو حکم ہوا اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے اسلامی مملکت میں ہو سکتے ہیں۔ غیر اسلامی مملکت میں اللہ کے احکامات جاری نہیں ہو سکتے۔

(5) قرآن میں ارشاد ہے کہ جو قوم بھی ایمان لائے گی اور قرآن کے مطابق اعمال کرے گی اللہ اس کو ضرور اقتدار دے گا۔ ایمان اور اعمال صالح کا لازمی نتیجہ اسلامی ریاست ہے۔

(6) حضور ﷺ کو حکم الٰہی ہوا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ (42:15) (اے رسولؐ) کہہ دو اللہ نے جو ضابطہ دیا ہے میں اس پر ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس ضابطہ کے مطابق عدل کروں۔ کتاب کے ساتھ عدل کرنے کے معنی یہی ہیں کہ اس کتاب کے مطابق عدل کرو اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ قرآن نے عدل کی تعریف Define line یہ کہہ کر دی وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ (7:181) خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ ہے تو وہ عدل ہے اگر کسی اور وضع شدہ قانون کے مطابق فیصلہ ہے تو وہ عدل نہیں ہے۔ اس آیت نے عدل کی تعریف بالکل واضح کر دی کہ قرآن کے علاوہ اور کوئی قانون عدل پر مبنی نہیں ہوتا۔

(7) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (3:85) ترجمہ: اور جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی ضابطۂ حیات پسند کرتا ہے سو اللہ کے ہاں وہ قبول نہیں اور انجام کار نقصان میں رہے گا۔

اس موضوع پر قرآن میں اتنی آیات ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہوسکتا مضمون طویل ہو گیا۔ ہم نے چند آیات تحریر کی ہیں۔ باقی آیات تحریر کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔

قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ، واحد مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی وہاں سے ہی اس جدوجہد کا آغاز کر دے کیونکہ نظامِ خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اس نظام کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ کی عبادت کرنے کے خواہاں ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہیں وہ اللہ و رسول کے باغی، عادی اور نافرمان ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز روزہ کے پابند ہوں۔